أَلَيسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ

تذکرہ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب کیات ڈابھیلیؒ

(ولادت: ۱۳۵۵ھ۔ وفات: ۱۴۳۵ھ)

زیر سایۂ عاطفت

حضرت اقدس مولانا احمد صاحب بزرگ سملکی مدظلہ

(مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل)

کاوش

محمد شہزاد اورنگ آبادی

ناشر

شعبۂ تقریر و تحریر

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

تفصیلات

اسم کتاب:.......تذکرہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کیات ڈابھیلی

کاوش:..شہزاد اورنگ آبادی

زیر سایۂ عاطفت:.......حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب سملکی زید مجدہ

صفحات:..۲۳۴

ناشر:........................شعبۂ تقریر وتحریر، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل

فہرست مضامین

بابِ دوم: اوصاف وکمالات

تقریظ

حضرت اقدس مفتی عباس داؤد بسم اللہ صاحب ڈابھیلی دامت برکاتہم

(صدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل، سملک)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مردم خیز خطہ سرزمینِ ڈابھیل میں ایک نعمتِ غیر مترقبہ اور رحمتِ الٰہی سے چشمۂ صافی جامعہ اسلامیہ کی صورت میں ایک صدی سے زائد عرصہ ہوا جاری ہے، جس کے فیض سے امت پیاس بجھا رہی ہے، اسی زمین میں آنکھ کھولنے والے بعض خوش نصیب اور باتوفیق اللہ تعالی کے ایسے بندے بھی ہیں جن کے علم وفیض سے امت کا ایک معتد بہ حصہ سیراب ہوا ہے، ان ہی میں ہمارے ہر دل عزیز استاذِ محترم حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب نور اللہ مرقدہ کا بھی شمار ہے، استاذِ محترم کی عمرِ مستعار اپنے والد ماجد کے انتقال کے وقت بہت کم تھی، کسے معلوم تھا کہ یہ یتیم بچہ مستقبل میں کیسے کیسے عظیم کارنامے انجام دینے والا ہے۔

آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے، تب نہ وہ کچھ جانتا ہے اور نہ اس کے متعلق کوئی کچھ جانتا ہے کہ کتنے دن دنیا میں رہے گا اور رہے گا تو کیا بن کر رہے گا، اس کے اندر کیا صلاحیت اور استعداد ہے اس کا بھی علم نہیں ہوتا، ﴿واللہ أخرجكم من بطون أمهاتكم لا تعلمون شيئا وجعل لكم السمع والأبصار والأفئدة لعلكم تشكرون﴾ (النمل) اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے نکالا

(اس حال میں نکالا کہ) تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے؛ تاکہ تم شکر گزاری کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیتِ کاملہ کے سائے میں انسان کو نشوونما بخشتے ہیں، اس کی صلاحیتیں مناسب ماحول کے تحت اجاگر ہونے لگتی ہیں، پھر اللہ تعالی جو چاہتے ہیں اس سے کام لیتے ہیں، اس کے کاموں اور اس کے فوائد کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا ہے اسی کے بقدر اس کو جاننے والے اور اس سے محبت کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، اس کے گذر جانے کے بعد اس کی جدائی کے صدمہ کو محسوس کرنے والے بھی بہت ہوتے ہیں؛ لیکن یہ قانونِ الٰہی ہے کہ: کسی کے لیے دوام نہیں ہے، اگر دوام ہوتا تو انبیا کے لیے ہوتا؛ کیونکہ عالمِ انسانیت کے لیے سب سے زیادہ ضرورت انبیا کی تھی؛ مگر حق تعالی نے ان کے لیے بھی ایک وقت مقرر کیا تھا، جب وہ وقت پورا ہوجاتا تو وہ بھی اٹھا لیے جاتے تھے، گو ان کے جانے سے انسانیت کتنا ہی دکھ محسوس کرے، یہ کارخانۂ عالم اسی طرح چل رہا ہے اور بالآخر اس کا بھی وقت پورا ہوجائے گا اور بساطِ کائنات لپیٹ دی جائے گی، اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا کیا جائے گا، اُس عالم میں البتہ خلود ودوام ہے، وہاں جو چیز ہوگی دائمی ہوگی، راحت ہے تو دائمی اور تکلیف ہے تو دائمی۔

مرنا تو برحق ہے اور موت ہر ایک کے حق میں مقدر ہے؛ لیکن یہی موت کسی کے حق میں پیغامِ فنا ہے اور کسی کے حق میں حیاتِ جاوداں، ایک آدمی مرتا

ہے تو اس کا سب کچھ مردہ ہوجاتا ہے، اس کا تذکرہ بھی مرجاتا ہے، اس کی روح بھی فراموش ہوجاتی ہے۔ اور ایک آدمی مرتا ہے تو صرف اس کا جسم بے جان ہوجاتا ہے؛ مگر اس کے کارنامے زندہ رہتے ہیں، اس کی زندگی کے وہ مخفی گوشے جنہیں اس کی حیات میں کم لوگوں نے جانا ہوتا ہے وہ بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو صرف کھانے پینے اور جسم کی خواہشات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نہیں جیتے؛ بلکہ کسی بڑے مقصد کے لیے جیتے ہیں، ان کی زندگی کھانے پینے کی ضرورت سے نہیں؛ بلکہ کسی خاص محور کے ساتھ منسوب ہوتی ہے اور اسی مقصد کے واسطے سے انہیں بڑائیاں ملتی چلی جاتی ہیں، کھانا پینا اور رہائش سب زندگی کی ضروریات ہیں، مقاصد نہیں ہیں۔

پھر مقصد کے کمتر و برتر ہونے کے لحاظ سے آدمی کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے اور اس کے بقا و دوام کے اعتبار سے انسان کو بقا و دوام کا تحفہ ملتا ہے، اگر مادّی چیزیں اس کا مقصد ہیں تو جتنی حیات مادہ کی اتنی حیات اس آدمی کی! اور اگر روحانی امور اس کا مقصد ہیں تو جس قدر عمر روح کی ہے اتنی ہی عمر اس روحانی آدمی کی ہے۔

استاذِ محترم نے جامعہ جیسی عظیم الشان درسگاہ میں پچپن سال تک متنوع خدمات انجام دیں، اگر اس مدت کے ساتھ زمانۂ طالبِ علمی کا عرصہ شمار کرلیا جائے تو احاطۂ جامعہ میں گذرے ہوئے لمحات کا دائرہ ستر سال (سات دہائی) تک

پھیل جاتا ہے، اس دور میں اتنی طویل خدمات کو مرحوم کی ''زندہ کرامت'' کہا جائے تو بجا ہے، اس مدت میں ملک وبیرونِ ملک کے ہزاروں طلبہ نے مرحوم سے اکتسابِ فیض کیا، جو آج بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ استاذِ محترم کی ذاتِ بابرکت سے اس مدتِ مدیدہ میں انجام پانے والی تدریسی وملّی خدمات کا عکسِ جمیل اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔

دعا کرتا ہوں اللہ تعالی اس کتاب کو بے حد قبول فرماوے، جن لوگوں نے اسے جمع کرنے، ترتیب دینے اور طبع کر کے منظرِ عام پر لانے کی مساعئ جمیلہ کی ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہمیں اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

کتبہ: عباس بن داؤد بسم اللہ عفی عنہ

۲۰/رجب المرجب ۱۴۳۸ھ سہ شنبہ

تقریظ

حضرت اقدس مفتی محمود صاحب بارڈولی دامت برکاتہم

(استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل)

اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کے اکثر لوگوں کی بدعملی سے تنگ آکر یہ جملہ ارشاد فرمایا: ﴿الیس منکم رجل رشید﴾ کیا تم میں کوئی مرد اچھا نہیں ہے؟ جو نیک چلن ہو، خود بھلا ہو دوسروں کی بھلائی چاہنے والا ہو، جو سیدھی صحیح، سچی بات کو سمجھے اور دوسروں کو بھی سمجھائے، جو خود نیکی اور تقوے کی راہ اختیار کرے اور دوسروں کو بھی نیکی اور تقوے کی راہ دکھاوے، خود معقول ہو، فہم وفراست سے کام لیتا ہو اور دوسروں کو بھی فہم وفراست سے کام لینے کی دعوت دیتا ہو۔ سیدنا حضرت لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ جملہ جو قرآنِ کریم میں نقل کیا گیا ہے وہ اپنے اندر ایک عظیم سبق رکھتا ہے، کسی قوم یا خاندان میں اگر ایک بھی ''رجلِ رشید'' صحیح فکر، کڑھن اور درد کے ساتھ اٹھے اور قوم کی صحیح رہبری کرے تو اس پوری قوم میں ایک دینی انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب ہمارے جامعہ ڈابھیل کے کچھ اس طرح کے اوصاف کے حامل ایک ''رجلِ رشید'': حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب نور اللہ مرقدہ کی حیاتِ مستعار کا عملی نقشہ ہے، یہ ''رجلِ رشید'' ڈابھیل کے رہنے والے تھے۔ بندہ کا ان سے بے تکلفی کا تعلق رہا۔ میرے اساتذہ کے ہم عمر وہم درجہ تھے، میرے قریبی

رشتہ دار بھی تھے اور میرے بہت سے رفقائے درس کے استاذ بھی تھے، ہمیشہ میرے ساتھ بے تکلفی اور اپنائیت کا برتاؤ کرتے تھے، نیز مولانا مرحوم متعدد اسفار میں میرے امیر بھی رہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ شعبۂ تقریر وتحریر کی طرف سے ان کی سوانحِ حیات پیش کی جارہی ہے، عزیزم شہزاد اورنگ آبادی درجۂ عربی چہارم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کو تیار کرنے کا بہترین کارنامہ انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنت کو خوب قبول فرمائے۔

ہمارے جامعہ کے جواں ہمت، جواں عمر اور مؤقر استاذ حضرت مولانا حافظ الحاج مفتی معاذ صاحب بمبوی مد ظلّہ کو اللہ تعالیٰ خوب جزائے خیر عطا فرمائے، انھوں نے برادرِ مکرم مفتی ابوبکر صاحب کی سرپرستی سے طلبۂ عزیز میں تقریر وتحریر کا بہت عمدہ ذوق وشوق پیدا کرنے کا کام شروع کیا ہے، اس کے بہترین نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو مزید ترقیات سے نوازے، ہمارے جامعہ کے مہتمم حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب دامت برکاتہم العالیہ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں ان کی توجہ اور مفید مشوروں سے یہ سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت وعافیت عطا فرمائے اور ان کی عمر میں برکت نصیب فرمائے اور اس سلسلہ کو دن دوگنی رات چوگنی کامیابی سے نوازے، آمین۔

(مفتی) محمود (صاحب) بارڈولی عفی عنہ

۲۳ / اپریل ۲۰۱۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آغازِ سخن

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ		یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ		وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

اگر کوئی شخص ''جامعہ ڈابھیل'' سے پوچھے کہ وہ کونسی شخصیات ہیں جن کا ماضی قریب میں چلا جانا تیرے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ثابت ہوا تو جامعہ زبانِ حال سے جن مبارک ناموں کا اظہار کرے گا ان میں رشیدِ جامعہ حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب ڈابھیلی کا اسمِ گرامی بھی یقیناً شامل ہوگا۔

حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب ڈابھیلیؒ بڑے بڑوں کے استاذ اور حقیقی معنوں میں استاذ الاساتذہ تھے، کئی نسلوں نے ان کے چشمۂ صافی سے تشنگی بجھائی اور بہتیرے لوگ ان کے آبِ زلال کے جرعۂ کش ٹھہرے۔ اگر آپ خدمات کا دائرہ دیکھیں تو ملک کی سرحدوں کو پھلانگ کر بیرون ملکوں تک پھیلا ہوا ملے گا اور اگر خدمات کا عرصہ دیکھیں تو دہائیوں پر محیط پائیں گے، کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذات میں علم کی چوکھٹ پر جاں سپاری کا جذبۂ بے پناہ ہمیشہ غالب رہا اور پوری زندگی اسی چوکھٹ پر پڑے رہے، یہاں تک کہ علم کی اسی دہلیز پر قربان ہو گئے۔

انسان کی قیمت نہ مال سے ہے نہ جان سے، نہ دولت سے ہے نہ عہدوں سے، انسان کی قدر و قیمت اوصاف اور خدمات سے ہے، اگر حضرت مولانا رشید

احمد صاحب کیاتؒ کے اوصاف کو نچوڑا جائے تو خلاصۃ الخلاصہ کے طور پر ایک وصف ممتاز ونمایاں ہوکر سامنے آئے گا اور وہ ہے مرحوم کی تواضع وعاجزی اور انکساری و بے نفسی۔ اسی طرح اگر خدمات پر نظر دوڑائی جائے تو ساری خدمات کا خلاصہ ایک ''خدمتِ خلق'' میں سمٹ آئے گا۔ غرض یہ کہ اوصاف وخدمات ہر دو اعتبار سے مرحوم ایک جامع ومنفرد شخص تھے۔

زیرِ نظر کتاب میں آپؒ کی حیات وخدمات پر آپ ہی ایک شاگردِ رشید اور خادمِ فرید عزیزم شہزاد اورنگ آبادی نے قلم اٹھایا ہے، چوں کہ آں عزیز کا مولانا مرحوم سے تلمّذ وشاگردی کا رشتہ بھی رہا ہے اور بہ حیثیت شاگرد کے خدمت کے زرّیں مواقع بھی نصیب ہوتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑی تڑپ وطلب، تلاش وجستجو اور محنت وجانفشانی کے بعد یہ مجموعہ مرتّب کیا ہے، جمعِ مواد کے سلسلے میں ان کی تگ ودَو اور دوڑ دھوپ کا اعتراف خود راقم آثم کو ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرماوے اور قلم کا یہ سفر۔ جس کی یہ پہلی منزل تھی۔ جاری رکھنے کی توفیق عطا فرماوے، آمین۔

اس موقع سے راقم شکرگزار ہے حضرت اقدس مفتی عباس بسم اللہ صاحب ڈابھیلی دامت برکاتہم کا جنہوں نے اس طالبِ علمانہ کاوش کو سنا، پڑھا، دیکھا اور مفید مشوروں ورہنمائیوں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ اپنے ''بابرکت کلمات'' بھی لکھ کر عنایت فرمائے، یہ حضرتِ والا کی عنایت وذرّہ نوازی کی بات ہے کہ اس

قدر مصروفیتوں کے باوجود ہم عزیزوں کی بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔

نیز بندہ استاذی الشفیق حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلّہ العالی کا بھی ممنون ومشکور ہے کہ آپ نے اس کتاب کی ترتیب کے دوران ذاتی توجہ ودلچسپی دکھائی، مواد فراہم کیا اور عدم الفرصتی کے باوجود حوصلہ افزا تقریظ بھی عنایت فرمائی۔

استاذی المکرّم مؤرخِ جامعہ حضرت مفتی عبد القیوم صاحب راجکوٹی مدظلّہ العالی کو کیسے بھلایا جاسکتا ہے کہ جب کبھی ہمارے اس عزیز کو کسی چیز کی ضرورت پڑی، کہیں کچھ پوچھنے کی نوبت آئی تو یہ بے جھجھک ان کے حضور پہنچ گئے، اورآپ نے ہمیشہ کی طرح تشفّی بخش جوابات عنایت فرما کر مقدور بھر رہنمائی فرمائی۔اسی طرح قاری شبیر صاحب زید مجدہ بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کا گراں قدر مفصل مضمون ہمارے اس عزیز کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ان کے علاوہ اساتذۂ جامعہ ودیگر علما وفضلا نے بھی خوب تعاون فرمایا،مرحوم کے اہلِ خانہ اوراعزہ واقارب نے طباعت کے لیے رقم فراہم کی جو قدر شناس وحوصلہ افزا مہتمم حضرت اقدس مولانا احمد بزرگ صاحب مدظلّہ العالی کے واسطے سے ہم تک پہنچی۔

نیز ہمارے قدیم مشفق وکرم فرما، استاذِ محترم حضرت مفتی ابوبکر صاحب پٹنی مدظلّہ العالی اوران کے مخلص رفقا کا منّت شناس ہوں کہ کمپوزنگ سے لے کر طباعت تک کے سارے گراں بار مراحل میں ان کا گرانقدر تعاون میسّر آیا۔

اللہ تعالیٰ ان تمام محبّین، مخلصین، معاونین اور محسنین کو بیش از بیش جزائے خیر عطا فرمائے، اپنی رضا کی دولت سے مالا مال فرمائے، اور ہم خُردوں پر ان کی شفقتوں کے سائے تادیر قائم ودائم فرمائے، آمین۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت والا کی رحلت سے جامعہ کو نا قابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا، مفاد پرستی وخود فریبی کے اس دور میں ایسے ''رجلِ رشید'' کا اٹھ جانا ایک ایسا جھٹکا ہے جس سے بڑے بڑے اِدارے ہل جاتے ہیں۔

آج جب کہ بندہ یہ سطریں لکھ رہا ہے کوئی مجھے سے پوچھ رہا ہے: ﴿الیس منکم رجل رشید﴾ اللہ تعالیٰ کے بے انتہا فضل وکرم کی یہ دولت جب جامعہ کی صفِ اول کے اپنے مشفق اساتذہ پر نظر پڑتی ہے تو دل بے اختیار جھوم اٹھتا ہے کہ: ہاں! اب بھی ظاہراً وباطناً، اسماً ومعناً بہت سے ''رجلِ رشید'' ہمارے سروں پر سایہ فگن ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے سائے کو بہ صحت وعافیت دراز سے دراز تر فرمائے، ان سے خوب استفادے کی توفیق بخشے اور ''رشید مرحوم'' کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کے صدقۂ طفیل ہم گنہگاروں کی نیّا بھی پار لگادے، آمین۔

منّت شناس

معاذ عبدالرزاق چارولیہ

۲۵/ رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

بروز یک شنبہ، قبیل المغرب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

۱۴۳۳ھ کی بات ہے کہ ایک چھوٹا سا دیہاتی بچہ جامعہ کے گیٹ میں داخل ہوا اور خراماں خراماں مسجد کے ایک گوشہ میں سامان رکھ کر دعا و نماز میں مشغول ہو گیا، نماز سے فارغ ہو کر داخلہ کی کارروائی شروع ہوئی، کسی ''رشید احمد کیات'' نامی مولانا کے پاس امتحان دینا طے پایا، الحمدللہ! امتحان میں کامیابی و سرخ روئی حاصل ہوئی اور داخلہ ہو گیا، پھر کتابیں ملیں، اور ان ہی مولانا رشید احمد کیات صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ابتدائی دنوں ہی میں آپؒ کو انتہائی خوش خلق اور اوصاف وکمالات کا حامل پایا، دل میں اس بات کی رغبت پیدا ہوئی کہ ایسے بزرگ استاذ کی خدمت ضرور کرنی چاہیے؛ لیکن یہ بچہ تو بالکل اجنبی تھا، شناسا ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا تھا، آخر کس کے سامنے اپنی اس دلی تمنا کا اظہار کرتا، ناامیدی کی کیفیت طاری ہو گئی، جس نے خدمت کے حوصلہ کو پست کر دیا، آخر درِ الٰہی میں دستِ سوال دراز کیا، باری تعالیٰ نے اسباب مہیا کر دیے۔

ایک دن استاذِ محترم نے اس بچے کو بلایا اور مسکراتے ہوئے کہا: باہر گاڑی کھڑی ہوئی ہے اس میں پٹرول ختم ہو گیا ہے، ذرا بھر آؤ۔ بچہ سمجھ نہ پایا، اس لیے کہ استاذِ محترم کو تو روزانہ سائیکل پر آتے دیکھتا تھا، تب استاذ جی نے اس طالبِ علم

کو بلایا جس نے گذشتہ سال آپ کی خدمت کی تھی، اور اُس سے کہا: اب تم اِن کو خدمت کا طریقہ سمجھا دو، اس نے بچے کو بالتفصیل سمجھایا، پھر آپ نے کہا: وہ بھی بتا دو کہ اگر پٹرول ختم ہوجائے تو کہاں بھروانے کا؟ طالبِ علم مسکراتے ہوئے کہنے لگا: استاذِ محترم کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب سائیکل میں ہوا کم ہوجائے تو دفتر کے نشیبی حصہ میں ''ہوا پمپ'' رکھا ہوتا ہے وہاں سے ہوا بھر لینا۔ پھر آپ نے بچے سے پوچھا: سمجھ میں آ گیا؟ بچے نے اثبات میں جواب دیا۔

بس! یہی گفتگو تھی جس نے بچے کو آپ کا خادم بنا دیا، پھر آہستہ آہستہ تعلقِ خاطر بڑھتا رہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مختلف مواقع پر گھر کی حاضری اور استاذ کے ساتھ دیگر کاموں میں شریک رہنے کا شرف حاصل ہوتا رہا، استاذ محترم بھی اپنی محبتوں، شفقتوں اور دعاؤں سے اخیر تک نوازتے رہے۔ آج اسی بچے کے ہاتھ میں قلم ہے اور وہ اپنے محبوب استاذ کو خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہے۔

راقم کی آخری ملاقات اُس وقت ہوئی جب ۱۴۳۵ھ کے امتحان کی سرگرمیاں مکمل ہوچکی تھیں، بندہ دولت کدہ پر گیا، خیر خیریت کے بعد اجازت طلب کر کے دعا کی درخواست کرتے ہوئے خوشی خوشی مدرسہ لوٹ آیا، اور گھر کی طرف رختِ سفر باندھنے میں مشغول ہوگیا۔ کسے پتہ تھا کہ جانا تو خوشیوں کے ساتھ ہوگا اور آنا غموں کے ساتھ، اور اس دیرینہ خادم کو اپنے محبوب مخدوم کا دیدار پھر کبھی نصیب نہ ہوگا۔ بہر حال جب چھٹیاں گزار کر گھر سے مدرسہ واپسی ہورہی

تھی تب ایک بھیانک خبر کان سے ٹکرائی، کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کیات کا انتقال ہوگیا، جس کی وجہ سے ہوش اڑ گئے، دل بے چین ہوگیا، پرانی یادیں تازہ ہوگئیں، آنکھیں نم دیدہ ہوئیں، دل غم سے نڈھال ہوکر رہ گیا۔ اسی مضطرب کیفیت کے ساتھ جامعہ پہنچ کر داخلہ کی کارروائی مکمل کی، پھر بعد العصر یہ خادم اپنے مخدوم کو تلاش کرتا ہوا قبرستان پہونچا، تو دیکھا کہ ایک رفیقِ درس آپ کی لحد سے متصل بیٹھا، ایصالِ ثواب کرتے ہوئے ہچکیاں باندھے رو رہا ہے، آخر کیوں نہ روتا:

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دُکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا
ہوائے غم سوچتی ہے کہ کس بھنور میں آ گئی
وہ ایک دِیا بجھا تو سینکڑوں دِیے جلا گیا
سکوت میں بھی اس کے ایک ادائے دل نواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا
دلوں سے وہ گذر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا
شریکِ بزم؛ دل بھی ہے چراغ بھی ہے پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

اُسی وقت یہ خادم بھی سر بہ گریباں ہو کر ایصالِ ثواب کر کے لوٹا، پھر تقریباً دو روز بعد تعزیتی جلسہ ہوا جس میں آپ کی خدمات کو اجاگر کیا گیا ''الدین وعزائم'' کے طلبہ نے بھی خصوصی شمارے تیار کر کے آویزاں کیے، جس میں راقم نے بھی دو صفحوں پر مشتمل ایک مضمون لکھا، پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

اِس خادم کو کہاں معلوم تھا کہ اِسے فقط ایصالِ ثواب اور دو صفحوں پر مشتمل تعزیتی مضمون پر اکتفا نہیں کرنا ہے، بلکہ کچھ مدت بعد اپنی طالبِ علمانہ کاوش کے ذریعہ اپنے بے لوث مخدوم کی حیاتِ مبارکہ پر مختصر سی روشنی بھی ڈالنی ہوگی، اگر اس خادم کو اس کا علم ہوتا تو ابتدا ہی سے معلوماتی پُرزوں کو اپنے کشکول میں یکجا کر لیتا اور موقع ملنے پر ان پُرزوں کو جوڑ کر آپ کی خدماتِ جلیلہ کی جھلکیاں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیتا۔

خیر! قصہ مختصر: ۱۴۳۷ھ کا تعلیمی سال اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شروع ہوا اور عیدالاضحیٰ کی تعطیلات قریب آ گئیں، اسی اثنا میں ایک مرتبہ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر درسگاہ کی طرف جا رہا تھا، سامنے سے جامعہ کے جواں سال استاذ مفتی معاذ صاحب زید مجدہٗ درسگاہ کی طرف تشریف لے جا رہے تھے، مجھے دیکھ کر قریب بلایا اور کہنے لگے: ایک کام کرنا ہے، تیار ہو؟ بندے نے عرض کیا کہ: آپ تو میرے استاذ ہیں، کیسے انکار کر سکتا ہوں، کہنے لگے: حضرت مولانا رشید احمد کیاتؒ صاحب پر مقالہ لکھنا ہے، میں نے کہا: وہ تو لکھ چکا ہوں۔ آپ نے کہا:

مضمون نہیں ؛مستقل سوانحی خاکہ تیار کرنا ہے۔ جب یہ جملہ سنا تو دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں، میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے ''انشاءاللہ'' کہہ دیا۔

چونکہ پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ''اُذکُرُوا مَحَاسِنَ مَوتَاکُم'' (اپنے گذرے ہوئے لوگوں کی خوبیوں کا تذکرہ کیا کرو) سن چکا تھا، نیز جب گذرے ہوئے بزرگوں کی خوبیاں سامنے آتی ہیں تو بعد والوں میں ان کی اقتدا و پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی جذبہ کے تحت استاذِ محترم کے سوانحی نقوش پر اِس خادم نے تیاری شروع کردی۔ پھر دیکھا گیا کہ وہی خادم جو اپنے مخدوم کی حیات میں ان کے تذکرے سے مجلس کو گل وگلزار کیے رکھتا تھا، ان کے انتقال کے بعد بھی اسی فکر میں اپنے مخدوم کے ہم شناس لوگوں سے روشنی حاصل کر کے حیاتِ مبارکہ کے تانے بانے جوڑ رہا ہے، اساتذہ کے گھروں کے چکر کاٹ رہا ہے اور ان سے حاصل شدہ مفید معلومات کو ٹوٹے پھوٹے انداز میں جمع کر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ جمع شدہ مواد کتاب کی شکل اختیار کر گیا اور اب اسی کو اصلاح وترمیم کے مرحلے سے گزار کر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ چونکہ حضرت الاستاذ کا کوئی مستقل خاکہ تیار نہ تھا اور نہ ہی اس سے قبل راقم کو سوانح نگاری کا کوئی تجربہ ہے؛ اس لیے عین ممکن ہے کہ اس میں غلطیاں در آئی ہوں، قارئین سے امید ہے کہ ان شکستہ سطروں کو طالبِ علمانہ کاوش کی نظر سے دیکھیں گے اور کوتاہیوں سے درگزر فرما کر حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

ان جذبات کے اظہار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث شریف ”مَن لَّا یَشکر النَّاس لا یَشکر اللّٰہ“. (ترمذی شریف، جلد:۲،ص:۱۷) کے پیشِ نظر اپنے محسنین ومعاونین کا ذکر کردوں، جن کی توجہات سے یہ حقیر سی کاوش زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آئی:

میں سب سے پہلے استاذ الاساتذہ حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم (صدر مفتی جامعہ ڈابھیل) کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنی ملّی و دینی مصروفیات کے باوجود پورا مقالہ سنا اور مواد سے لبریز اپنے ملفوظات سے نواز کر مقالہ میں چار چاند لگا دیے، اللہ تعالیٰ آپ کے سایۂ عاطفت کو تادیر ہم طالبانِ علومِ نبوت کے سروں پر باقی رکھ کر استفادہ کی راہیں ہموار فرمائے، آمین۔

نیز حضرت مہتمم صاحب کا بھی بڑا احسان رہا کہ آپ نے دفتری معلومات اور جامعہ کی خدمات کی طرف رہنمائی کر کے عاجز کی حوصلہ افزائی فرمائی، اور ہر وقت ہر قسم کا تعاون آپ کے واسطے سے میسر آیا، اللہ تعالیٰ آپ کو خوب خوب جزائے خیر عطا فرمائے، اور آپ کی قدر شناس ذاتِ عالی کو بہ صحت وعافیت ہم چھوٹوں پر باقی رکھے، آمین۔

نیز حضرت قاری شبیر صاحب نرولی مدظلہ کا بھی بہت ہی ممنون ومشکور ہوں کہ آپ نے تقریباً ۳۰؍صفحات پر مشتمل ایک مستقل مضمون بندہ کی رہنمائی کے لیے تیار کیا، آپ کے اس احسان کو راقم کبھی فراموش نہیں کر سکے گا، ان شاء اللہ۔

نیز ان حضرات کے علاوہ اور بھی میرے جن اساتذۂ کرام کا تعاون اس کم سواد کو حاصل رہا ان سب کا بہ صمیم قلب ممنون ہوں، مثلاً: حضرت مفتی ابوبکر صاحب پٹنی مدظلہ العالی، حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی، حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ العالی، حضرت مفتی عبدالقیوم صاحب راجکوٹی مدظلہ العالی، مفتی معاذ صاحب مدظلہ، مفتی عرفان صاحب مدظلہ، مفتی اویس صاحب مدظلہ۔

اسی طرح اُن تمام رفقائے درس اور دیگر معاون دوستوں کا بھی تہہِ دل سے شکرگزار ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت فارغ کر کے بندے کا بہت سارے کاموں میں تعاون کیا۔ اللہ رب العزت ان تمام رفقائے درس اور عزیز دوستوں کو اپنا محبوب و مقبول بندہ بنا کر دینِ متین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے، آمین۔ اس موقع پر میں اپنے مہربان و مشفق والدین اور مربّی اساتذہ کو ہرگز فراموش نہیں کرسکتا، جن کی دعاؤں اور توجہات کی بدولت بندہ چند ٹوٹے پھوٹے انداز میں چند سطریں سپردِ قرطاس کرسکا۔

نیز میں ممنون و مشکور ہوں استاذِ محترم کے فرزند جناب حافظ اسماعیل صاحب زید مجدہٗ اور آپ کے برادرِ خُرد مولانا یوسف صاحب مدظلہ العالی کا جنھوں نے کتاب کی طباعت کے لیے خاطر خواہ رقم سے نواز کر عاجز کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں دارین میں خوب انعامات سے نوازے۔

میں اپنی اِس کاوش کو پیش کرتا ہوں اُس ربِ کائنات کے حضور جس نے مجھے اظہارِ مافی الضمیر کی توفیق عنایت کی، اِس دعا کے ساتھ: خدایا! جس طرح تو نے استاذِ محترم کے احوال وواقعات لکھنے کی توفیق عطا فرمائی، اسی طرح ان کے اخلاص وایثار، اخلاق واعمال اورعلم ومعرفت کا کچھ شمّہ بھی اس گناہ گار نیز تمام معاونین وقارئین کوعطا فرما اوراس حقیرسی کاوش کواپنے دربارمیں شرفِ قبولیت سے سرفرازفرما،آمین۔

شہزادابن چانداورنگ آبادی
متعلم: جامعہ ڈابھیل
مؤرخہ:۲۹ / جمادی الثانیہ ۱۴۳۸ھ

بابِ اول

سوانحی نقوش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخ کا ہر طالبِ علم جانتا ہے کہ گجرات؛ سرزمینِ ہند کا وہ خطہ ہے جہاں سالہا سال شاہانِ گجرات کی سرپرستی وعلم پروری کے زیرِ سایہ اسلام کو چہار دانگِ عالم میں پھیلانے کے لیے مضبوط و مستحکم اسلامی قلعے سرگرمِ عمل رہے۔ انگریز کی منحوس آمد سے جہاں قابلِ رشک حکومتیں اجڑ گئیں وہیں علمی حلقے بھی سونے پڑ گئے۔ ایک طویل عرصے تک جہالت وضلالت کی اندھیر نگری میں بھٹکتے رہنے کے بعد دینی مدارس قائم ہونے شروع ہوئے، جن کے وجود سے تیرگی روشنی میں بدلنے لگی اور ضلالت کی جگہ ہدایت کا نور پھیلنے لگا۔ رفتہ رفتہ مدارس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور آج جا بہ جا مدارس کا مضبوط پھیلا ہوا جال مسلمانانِ گجرات کے دین وایمان کی محافظت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

ان ہی مدارس میں سے اولین مرحلے میں وجود پانے والا ایک مدرسہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین بھی ہے، گجرات کی سرزمین پر پھیلے ہوئے دینی مدارس کی فہرست میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک اپنا بلند مقام رکھتا ہے۔ ڈابھیل سملک سرزمینِ گجرات کا وہ حصہ ہے جہاں پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ مدتوں سے جاری وساری ہے، سالہا سال سے اِس پر فیضانِ باری سایہ فگن ہے، جس کے نتیجہ میں اس چھوٹے سے قریہ سے علم وفضل کی کئی کلیاں مسکائی ہیں اور کئی گل کھلے ہیں۔ اس کے چاروں طرف جمالِ علم وحکمت کی کئی رعنائیاں بکھری

ہیں، یہ علم وعرفاں کا مخزن، فضلائے دہر کا معدن اور نامور شخصیتوں کا مرجع رہا ہے۔ اسی سدا بہار گلشن کا ایک شگفتہ پھول ۔جس کی خوشبو ملک و بیرونِ ملک کے مختلف علاقوں میں شاگردوں کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔ مشفق و مربّی استاذِ محترم حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب ڈابھیلیؒ کی ذات گرامی ہے۔ آپ ایک طویل عرصے تک جامعہ میں دین کی خدمت انجام دے کر، مؤرخہ: ۳ر شوال بروز: بدھ، ۱۴۳۵ھ کو انتقال فرما گئے۔

تیرے وجود کی ٹھنڈک سے ہرا بھرا تھا گلستاں
وہ پاکیزہ روح کہاں گئی کہ سارا چمن مرجھا گیا

محفل سے اٹھ کے رونقِ محفل کہاں گئی		کھل اے زبانِ شمع! کہ کچھ ماجرا کھلے

ان اوراق میں استاذِ محترم کی حیات و خدمات اور اوصاف و کمالات کو اجاگر کرنے کی ایک طالبِ علمانہ کوشش کی گئی ہے؛ تاکہ نقوش؛ نفوس کے لیے رہنما بن سکیں اور بعد میں آنے والی نسلیں بھی اپنے اکابر کے نقشِ قدم پر چل کر کامیاب وسرخ رو ہو سکے۔

ولادت

استاذِ محترم صوبۂ گجرات، ضلع نوساری کے ایک مشہور گاؤں ڈابھیل میں ٦ / جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ مطابق ۲۴ / اگست ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت؛ سعادت و نیک بختی کا پیغام لیے ہوئے آئی، آپ کی آمد اہلِ خاندان کے

واسطے مولیٰ کی بہت بڑی عنایت اور گاؤں والوں کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوئی۔

ڈابھیل اور سملک کی خدمات ایک نظر میں

استاذِ مکرم حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدّظلہ العالی (استاذ حدیث وفقہ وقاضیٔ شریعت جامعہ ڈابھیل) رقم طراز ہیں: ''اس دنیائے دوں میں فضلِ رب کا ایک بہت بڑا مظہر یہ بھی رہا ہے کہ: اس نے اپنی بنائی ہوئی زمین کے بعض خطّوں کو اپنے دینِ متین کی نشر واشاعت کے لیے قبول کرلیا، وہاں کی مٹی اتنی زرخیز ثابت ہوئی کہ کرۂ ارض کے دیگر رقبے اور خطّے اس پر عش عش کرنے لگے، ایسی ایسی نامور شخصیات اور اپنی انتھک محنتوں سے آناً فاناً انقلاب بپا کردینے والی ہستیاں ایسی سرزمین سے اس عالمِ فساد کو میسر ہوئیں جنہوں نے نہایت ہی قلیل عرصے میں کایا پلٹ کرر کھ دی۔

ان بستیوں کے منجملہ ایک ڈابھیل سملک کی بستی ہے، جہاں آج سے کچھ سال پہلے خدا کی ایک نہایت ہی برگزیدہ اور ستودہ صفات ہستی نے جنم لیا، جس کے ہاتھوں بالواسطہ اللہ جانے کتنی مدت تک چہار دانگِ عالم میں پھیلے ہوئے تشنگانِ علومِ نبوت کو مائے زلال فراہم ہوتا رہے گا۔ اس موقع سے اہالیانِ ڈابھیل وسملک بھی مستحقِ سپاس ہیں کہ انھوں نے اپنے عرصۂ دراز کے بھرپور تعاون سے اس ربّانی باغ کولہلہاتا رکھنے کے لیے آب یاری کے تمام سامان بہم پہنچائے، ایک دن وہ تھا جب ان بستی والوں نے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے جمع کردہ مٹھی بھر

غلّے کے ذریعہ اس جامعہ کے پھولنے، پھلنے اور پنپنے کے لیے لہوئے پیہم پہنچایا تھا، اور ایک آج کا دن ہے کہ اہلِ قریہ کی عنایات، ان کے گراں قدر عطایات اور مختلف حیثیتوں سے ان کا تعاون جاری وساری ہے۔ ”ادام اللہ برکاتھم وأفاض علینا من عنایاتھم“۔

ان ہی خدماتِ پُرخلوص کے زیرِ اثر ربِ ذوالجلال نے ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾ کے بموجب ان اہالیانِ ڈابھیل وسملک میں اپنے دین کے ایسے خدام پیدا فرمائیں جنہوں نے اپنے فیضانِ عرفانات سے ایک عالم کو فیض یاب کیا۔ ماشاء اللہ! ڈابھیل وسملک کی ان ہی بستیوں میں ایک نہیں، کئی ایک؛ چند نہیں، ایک بڑی تعداد میں اصحابِ علم وہنر پیدا ہوئے جنہوں نے اس چمنِ احمدی کی آب یاری میں اپنا سب کچھ لُٹا دیا، عمریں کھپادیں، اس حیاتِ مستعار کے قیمتی لمحوں کو جامعہ کی خدمات کے لیے پیش کرنے میں اپنی عین سعادت سمجھی، انہیں نامور شخصیات میں سے ایک عجوبۂ روزگار ہستی مخدومنا حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب -نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعه وافاض علینا برکاته- کی ذاتِ گرامی بھی ہے“۔

والدِ محترم کا مختصر تعارف

استاذِ محترم کے والد کا نام اسماعیل تھا، آپ ”کیات“ خاندان سے تعلق رکھتے تھے، کسی دارالعلوم سے باضابطہ سند یافتہ عالم نہیں تھے؛ مگر اہلِ مدارس اور

علما سے دلی تعلق و ربط رکھتے تھے، حفظِ قرآن کی دولت سے بہرہ ور تھے، کئی سالوں تک اطراف واکناف میں قرآنِ کریم تراویح میں سناتے رہے، آپ کا قرآنِ شریف کی بہ کثرت تلاوت کرنا اِس دیار میں مشہور ومعروف تھا۔ عہدِ شباب میں بھی دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا فکر غالب رہا۔

جب عین جوانی کو پہنچے تو ایک ایسی مریم نامی خاتون سے رشتۂ ازدواج طے پایا، جن پر مریم نام کا اچھا خاصا اثر تھا اور جن کی شرافت، شرم وحیا اور پاکیزگی کے گُن گائے جاتے تھے۔ ابھی زندگی کے کچھ مراحل گذرے تھے کہ اچانک موت کا فرشتہ آدھمکا، اور یہ وہ وقت تھا جہاں زندگی میں امیدوں کی بہار ہوتی ہے، انسان یہاں سے زندگی کا نیا لائحۂ عمل طے کرتا ہے، بالآخر یہ نوجوان عین جوانی میں تین قیمتی موتیوں کو چھوڑ کر اپنے اہل وعیال کو داغِ مفارقت دے گیا، جن میں ایک: حضرت الاستاذ مولانا رشید احمد کیات صاحبؒ جن کی عمر اُس وقت تقریباً آٹھ سال تھی، اور دوسرے: حنیف بھائی جن کی عمر اُس وقت تقریباً چھ سال کی تھی، (یہ فرزندِ ثانی کسی بیماری کی وجہ سے ۱۲/سال کی عمر میں اپنے ربِّ حقیقی کو جا ملے) اور تیسرے: مولانا یوسف احمد کیات صاحب دامت برکاتہم جن کی عمر اُس وقت تقریباً ۱۱/مہینے کی تھی۔ آخر الذکر صاحب زادے بعد میں لندن کے شہری ہو گئے اور ابھی ماشاء اللہ باحیات اور خدمتِ دین میں مصروف ہیں۔

والدۂ محترمہ کا مختصر تعارف

خدا کی عنایت کا تحفہ ہے ماں		حقیقت میں جنت کا خطّہ ہے ماں
ہے شبنم کی ٹھنڈک، گلوں کی مہک		گلستاں کا رنگین نظارا ہے ماں

شفیق و مربّی باپ کا سایہ بچپن ہی سے اٹھ چکا تھا، سلام اور صد آفریں ہو اُس ماں پر جس نے اپنی معصوم اولاد کی تعلیم و تربیت کے خاطر دوسرا نکاح نہیں کیا۔ استاذِ محترم کی والدہ ماجدہ ایک نیک سرشت، اچھے اور شریف گھرانے کی تربیت یافتہ خاتون تھیں، زمانہ کے اچھے برے سے واقف تھیں۔ انہوں نے نوجوان شوہر کے انتقال کے بعد استاذِ محترم اور آپ کے چھوٹے بھائی کی تعلیم و تربیت کے لیے جس ہمت و استقلال سے کام لیا اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بی بی مریم رضی اللہ عنہا کی کچھ جھلکیاں نام کے ساتھ کردار میں بھی پائی ہوئی تھیں۔ بہت بڑی قربانی کی بات ہے کہ ایک خاتون اپنے دو فرزندوں کے خاطر اپنی جوانی کی پرواہ کیے بغیر دوسرے نکاح سے انکار کر دیتی ہے اور اپنے ان دو معصوم بچوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتی ہے۔ اس قربانی کا نتیجہ کافی حد تک مفید ثابت ہوا اور دونوں صاحبزادے علم و عمل کے روشن چراغ ثابت ہوئے۔ اس خاتون کے دونوں فرزندوں کا فیض دنیا کے کن کن گوشوں میں پھیلا ہوگا، یقیناً اسے شمار کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔

آپ کی والدۂ محترمہ کے بارے میں حضرت مفتی عباس صاحب دامت

برکاتہم (صدر مفتی جامعہ ڈابھیل) فرماتے ہیں کہ: وہ بہت اچھا قرآن پڑھتی تھیں، صحت کے ساتھ پڑھنا ان کا معمول تھا۔ اُس زمانہ میں ڈابھیل میں کوئی ایسا مدرسہ نہیں تھا جہاں لڑکیاں تعلیم حاصل کرتیں، استاذِ محترم کی والدہ نے تعلیمِ قرآن کا سلسلہ اپنے ذمہ لے لیا۔ میری (مفتی عباس صاحب) والدۂ محترمہ خود آپ کی شاگردہ رہی ہے، اور ڈابھیل گاؤں کی کئی عورتیں آپ کی شاگردہ رہی ہیں، آپ ہر ایک کو اہتمام کے ساتھ صحیح صحیح قرآن شریف پڑھاتی تھیں۔ نیز اردو دینیات کی تعلیم بھی دیتی تھیں، تقریباً ۳۰/ سال تک یہ خدمات انجام دیتی رہیں۔

میری والدہ معلّمہ کیسے بنیں؟

اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ ماں کی آغوش اپنے بچوں کے لیے پہلی درسگاہ ہے؛ لیکن ماں بھی تو ایسی ہونی چاہیے جو حقیقی معنی میں درسگاہ کی حیثیت رکھتی ہو اور اپنی اولاد کی صحیح تربیت پر قادر ہو، ایسی مائیں نایاب تو نہیں؛ لیکن کم یاب ضرور ہیں، ان ہی کم یاب ماؤں میں سے ایک استاذِ محترم کی والدہ بھی رہی ہے جن کی زندگی کی قدرے تفصیل اسی مائی کے فرزند، حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ کے شاگرد علامہ یوسف بنوریؒ کے نورِ نظر: مولانا یوسف صاحب کیات مدظلّہ العالی (برادرِ خرد مولانا رشید احمد کیاتؒ) کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں کہ:

''میری نانی امّاں روٹیاں پکانے کے لیے جامعہ میں جایا کرتی تھیں، اُس وقت میری والدہ اور خالہ، نانی امّاں کے ہمراہ جاکر ان کا ساتھ دیتیں، عمر اتنی زیادہ

نہیں تھی؛ بلکہ پڑھنے کے قابل تھی، ایک مرتبہ جامعہ کے استاذ حضرت قاری یامین صاحبؒ نے۔ جو جامعہ میں شعبۂ تجوید وقراءت کی خدمات میں مصروف تھے۔ میری والدہ اور خالہ کو دیکھ کو اپنی دوررس نگاہوں سے پرکھ لیا کہ یہ مستقبل میں کچھ کام کرسکنے والی لڑکیاں ہیں، چناں چہ انہیں قرآن شریف پڑھانے کا شوق ہوا، تو میری نانی امّاں سے کہا: خالہ جان! آپ ان دونوں بچیوں کو قرآن شریف پڑھانے کے لیے تیار ہو؟ نانی اماں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا: قاری صاحب! نیک کام میں دیر کس بات کی!! اس وقت سے میری والدہ اور خالہ بجائے نانی امّاں کا ساتھ دینے کے قرآن سیکھنے میں مصروف ہوگئیں، اور قاری صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے قرآن شریف کو تجوید سے پڑھنے میں کافی عمدگی اور مہارت حاصل کی، نیز اردو وغیرہ میں اچھی قابلیت رکھتی تھیں جس کا نتیجہ تھا کہ آپ نے عارفین کی اکثر کتابیں از اول تا آخر ختم کی تھیں، غرض یہ کہ علم سے بہت لگاؤ تھا۔ مجھے بھی جامعہ سے دورۂ حدیث کی فراغت کے بعد دار العلوم دیوبند بھیجا، میں والدہ کی خواہش کے مطابق وہاں چلا گیا اور پھر وہاں پہنچ کر ''تخصص فی التفسیر'' میں داخلہ لیا اور ہماری ہی وہ قابلِ مبارک باد جماعت ہے جس سے دار العلوم میں فنِ تفسیر کی ابتدا ہوئی، پھر فراغت کے بعد میں برطانیہ میں مقیم ہوگیا، والدہ اور بھائی (مولانا رشید احمد) ڈابھیل گاؤں ہی میں فروکش رہے، بھائی کا بھی تقرر جامعہ میں ہوگیا۔

والدہ عرصۂ دراز سے گھر ہی میں مکتب کی خدمت انجام دے رہی تھیں،

ابتدا اس کی اس طرح ہوئی کہ اُس وقت جامعہ میں تو تجوید و تعلیم کا نظام تھا؛ لیکن ڈابھیل گاؤں میں باقاعدہ لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی نظم و نسق نہیں تھا، اور اس حالتِ زار کی وجہ سے والدہ پر ایک صدمہ طاری تھا، چناں چہ اس کے پیشِ نظر والدۂ محترمہ نے گھر ہی میں مکتب کا آغاز کیا، اور قرآن شریف اور اردو کی اہم اہم کتابیں نصاب میں شامل فرمائیں، والدۂ محترمہ آنے والی لڑکیوں کو بڑے انوکھے طرز سے قرآن شریف اور اردو وغیرہ سکھلاتی تھیں، اور احکامِ اسلام کے اہم اہم پہلوؤں کو ان کے سامنے خوب واضح کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ مدتوں جاری رہا، تقریباً یہ خدمت آپ ۳۰/ سال تک انجام دیتی رہیں، اور ان ایام میں ڈابھیل گاؤں کی کئی لڑکیوں نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا جو آج ملک و بیرونِ ملک کے مختلف علاقوں میں پھیل کر گھریلو فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ اپنے اس پڑھے ہوئے سے خوب فائدہ اٹھا رہی ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کو والدہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے، آمین''۔

تعلیم و تربیت

تعلیم کا آغاز سعادت مند و نیک بخت ماں کی آغوش ہی میں ہوگیا تھا، لڑکپن میں والدۂ محترمہ سے مادّی غذا کے ساتھ روحانی غذا یعنی تعلیم و تربیت کا بھی وافر حصہ پایا۔ والدۂ ماجدہ نے اولاً آپ کو گاؤں کے مکتب میں داخلہ دلایا اور ساتھ ہی جامعہ کے تحت چلنے والے اسکول میں عصری تعلیم حاصل کرنے کے لیے

بھیجنے کا اہتمام فرمایا۔ جب استاذِ محترم گاؤں کے مکتب میں ''قاعدہ'' وغیرہ مکمل کر چکے تو آپ کی والدۂ محترمہ نے تعلیمی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے اپنے اس کم سن معصوم بچے کا داخلہ گجرات کے شہرۂ آفاق ادارہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں کرایا جس کو ایک ایسے بزرگ بانی (حضرت مولانا احمد حسن بھام سملکیؒ) کی خدمات وتوجہات حاصل رہی تھیں جس کا مسلک شاعری کی زبان میں کچھ اس طرح تھا:

اپنے لہو کو دھو کے پی، زخموں پر زخم کھا کے جی
آہ نہ کر، لبوں کو سی ! عشق ہے یہ دل لگی نہیں
سینے پہ تیر کھائے جا، آگے قدم بڑھائے جا
یعنی زبانِ حال سے کہہ دے کہ: ہاں ! ستائے جا

اور جس ادارے کی ترقی میں حضراتِ اکابر کا وہ مبارک گروہ تھا جن کے علم وعمل کا شہرہ ملک ملک، صوبہ صوبہ، شہر شہر اور قصبہ قصبہ پھیلا ہوا ہے جن میں سرِ فہرست: (۱) علامہ انور شاہ کشمیریؒ (۲) حضرت مفتی عزیز الرحمن عثمانی صاحبؒ (۳) حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی صاحب (۴) حضرت علامہ شبیر عثمانی صاحبؒ (۵) حضرت مولانا یوسف بنوریؒ (فاضلِ اول جامعہ ڈابھیل) اور ان کے علاوہ اور بھی دیگر بڑے بڑے حضراتِ علما ہیں، ایسے عظیم المرتبت ادارے میں تعلیم و تربیت کے مواقع حاصل ہو جانا آپ کے لیے کسی بیش بہا نعمت سے کم نہ تھا۔

اس سلسلہ میں آپ کے شاگرد مولانا عبدالرحمٰن صاحب کولہاپوری مدظلہ (استاذ جامعہ خیر العلوم ادگاؤں) رقمطراز ہیں کہ: ''استاذِ محترم نے جامعہ میں اُس وقت داخلہ لیا تھا جس زمانہ میں جامعہ کی قسمت کا ستارہ پورے عروج پر تھا، اوراس کے ماتھے پر علم کی ایک پوری کہکشاں رقص کررہی تھی، اوراگر یہ سچ ہے کہ سورج کے فیضِ صحبت سے چاند کو روشنی ملتی ہے اور چاند؛ چاند بنتا ہے، تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کہکشانِ علم کے متعدد ستاروں سے اکتساب فیض کرنے والا یہ جوہرِ صالح صدہا قمر سے زیادہ روشن، اورآسمانِ علم کا نیّرِ تاباں بنا۔

لاتسئل عن المرء وسَلْ عن قرينه		فإن القرين بالقرين يقتدي

لہٰذا حضرت مولانا مرحوم کی عظمتِ شان کی ایک بڑی دلیل وہ پاک مکرّم اساتذۂ کرام ہیں جن سے حضرتِ والا کو ایک مدت تک صحبت حاصل رہی''۔

داخلہ کے وقت استاذِ محترم کی عمر ۱۲/ سال سے متجاوز نہ تھی، بالآخر آپ نے پندرہ سال کی عمر تک ناظرہ و دینیات کی ابتدائی تعلیم انتہائی محنت وجاں فشانی کے ساتھ مکمل فرمائی۔ پھر ۱۳۶۵ھ میں درجۂ حفظ میں باقاعدہ داخلہ لیا، حفظ کی تکمیل کے بعد جامعہ میں ہی درسِ نظامی کا آغاز فرمایا، اور دھیرے دھیرے اپنے علمی سفر میں ترقی کرتے رہے، حتیٰ کہ زمانۂ طالبِ علمی ہی میں ربِّ کریم کے فضل و کرم سے آپ نے اپنے آپ کو اتنا قابل و باکمال بنالیا کہ اساتذہ بھی آپ سے انتہائی محبت کرنے لگے۔ اور یہ چیز استاذِ محترم کو اس لیے حاصل ہوئی تھی کہ آپ

نے صرف تعلیم پر ہی توجہ نہیں دی تھی؛ بلکہ جب آپ شعور کی منزل کو پہنچے تو خود اپنی تربیت کی طرف توجہ فرمائی۔ آپ کو بچپن ہی سے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ والدِ محترم کا انتقال ہو گیا ہے، بسا اوقات والدِ محترم کی یاد میں تڑپ اٹھتے تھے، اگر چہ والدۂ محترمہ بہت محبت کرتی تھیں؛ لیکن بن باپ کے بچوں پر جو حالات قدرتاً وعموماً آیا کرتے ہیں آخر وہ آپ پر بھی آئے۔ خاندان والے آپ کے متعلق یہ بات بھی سناتے ہیں کہ: آپ بچپن میں ایک عرصہ تک والد صاحب کو یاد کر کے نم دیدہ ہو جاتے تھے، آخر ایسا کیوں نہ ہو کہ

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں!

اساتذۂ کرام

انسان کی تعمیر وترقی میں والدین کے بعد سب سے زیادہ اہم کردار اساتذۂ کرام کا ہوتا ہے۔ ہر استاذ کی تمنا عموماً یہ ہوتی ہے کہ میرے پاس پڑھنے والا طالبِ علم چمنِ علم وحکمت کا شگفتہ پھول بنے اور آسمانِ عمل کا روشن آفتاب و ماہتاب بنے اور اس کی کرنیں دنیا کے چپے چپے اور اس کی خوشبو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچے، جس سے ساری دنیا اکتسابِ فیض کرے اور اخروی اعتبار سے یہ طالب علم ہمارے لیے نجات اور ذخیرۂ آخرت بنے۔ استاذِ محترم نے بھی ایسے ہی باکمال اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا تھا، جو جامعیت، ہمہ گیریت اور انفرادیت

کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے، علم وحکمت کے میدان میں جنہیں منفرد مقام حاصل تھا، ان ہی اساتذہ کی سوچ وفکر، علم وکمال، تواضع وانکساری، اوران کے مزاج ومذاق کا ایک وافر حصہ استاذِ محترم کونصیب ہوا، اوریہی چیز بعد میں آپ کی مقبولیت کا سبب بنی۔

آپ کے اساتذہ کے سلسلے میں ہرایک کے متعلق تعیین کے ساتھ کوئی قطعی روایت موجودنہیں ہے، کہ آپ نے کس استاذ سے کونسافن پڑھا، البتہ شیخ الحدیث حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندیؒ سے آپ نے بخاری شریف، شمائلِ ترمذی اورسنن ابوداؤد پڑھی ہے۔ اس کاعلم راقم کوخود استاذ کی زبانی ہوا، استاذِ محترم متعدد مواقع پرآپ کا ذکرِ خیرکیا کرتے تھےاور بہ کثرت زیادہ محبت وتعلق کا اظہارفرماتے تھے۔ ان کے علاوہ حدیث وفقہ کی کتابیں ان حضرات کے پاس پڑھیں: ابن ماجہ، نسائی، ہدایہ آخرین اورمشکوۃ حضرت مولانا عبدالغفور پٹھان صاحبؒ کے پاس پڑھی، اورموطین مولانا احمد بیمات صاحبؒ کے پاس۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے شفیق ومحبوب استاذ حضرت مولانا شریف حسن صاحب دیوبندیؒ کے کچھ مختصر حالات سپردِ قرطاس کروں۔

شیخ الحدیث مولانا شریف حسن صاحب دیوبندی کا مختصر تعارف

حضرت مولاناؒ یوپی کے مشہور علمی قصبے دیوبند میں ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے، اوردیوبند ہی میں قرآن شریف حفظ کیا، بعدہ تین سال تک

فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں بہٹ (ضلع سہارنپور) کے مدرسہ میں رہ کر پڑھی، بعد ازاں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوکر وہاں کے ماہر اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا، اور ۱۳۵۸ھ میں درسِ نظامی کے نصاب کی تکمیل کرکے دورۂ حدیث سے فارغ التحصیل ہوئے۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مدرسہ امدادالعلوم خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ''صدر مدرّس'' مقرر ہوئے۔ حضرت مولاناؒ کو جملہ علوم وفنون میں کافی مہارت حاصل تھی۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فیضِ صحبت سے حدیث وافتا سے خاص مناسبت پیدا ہوگئی تھی۔ تقریباً ۱۳۶۴ھ میں مدرسہ اشاعت العلوم بریلی کے ''صدر مدرس'' بنائے گئے، وہاں درسِ حدیث کے ساتھ افتا کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۹/سال کے بعد یعنی ۱۳۷۳ھ میں جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات میں ''شیخ الحدیث'' کے منصب پر فائز ہوئے، یہاں ''بخاری شریف'' کے ساتھ ''جامعِ ترمذی'' بھی آپ ہی کے زیرِ درس رہی۔ پھر ۱۳۸۳ھ میں انہیں دارالعلوم دیوبند بلالیا گیا۔

علمِ حدیث سے خاص شغف تھا۔ حضرت مولانا فخر الدین صاحبؒ کے بعد بخاری شریف کے درس کو سنبھالنا ان کا بڑا علمی کارنامہ ہے۔ تا دمِ واپسیں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کی پوری زندگی درس وتدریس اور علومِ دینیہ کے طلبہ کی خدمت میں گذری، ان کا درس علمی مواد سے بھرپور ہوتا تھا، طلبۂ حدیث ان کے درس سے مطمئن ہوکر اٹھتے تھے، وفات سے چند گھنٹہ قبل تک ان کا

علمی فیضان جاری تھا، علم وعمل، زہد وتقویٰ اور اوصاف وکمالات میں اکابر علما کی یادگار تھے۔ وہ اپنے علمی تبحّر اور علمِ حدیث سے خصوصی تعلق وشغف اور پاکیزہ نفسی کے باعث اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ۱۴/۱۵/ جمادی الثانیہ ۱۳۹۷ھ کی درمیانی شب تقریباً ۵۹/ سال کی عمر میں بعارضۂ قلب چند گھنٹوں کی مختصر علالت کے بعد واصل بحق ہو گئے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ۔ قبرستانِ قاسمی ان کی ابدی آرامگاہ ہے۔

(تاریخِ دار العلوم دیوبند، ص: ۱۶۸، منقول از تاریخِ جامعہ ڈابھیل، ص: ۳۷۸)

دیگر اساتذۂ کرام

ذیل میں مذکورہ بالا اساتذۂ کرام کے علاوہ استاذِ محترم کے ان جلیل القدر اساتذہ کے اسمائے گرامی لکھے جاتے ہیں جن سے آپ نے اکتساب فیض کیا ہوگا، استاذِ محترم کے دورِ طالب علمی کے سنین اور تاریخِ جامعہ ڈابھیل میں موجود فہرستِ اساتذہ کے توافق کو دیکھتے ہوئے افادہ اور استفادہ کے تعلق کو متعین کیا گیا ہے، قطعی اور یقینی بات نہیں کہی جا سکتی ہے ایک طالب علمانہ تخمینہ ہے جسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے:

۱) مولانا محمد ایکھلوایا صاحب ڈابھیلیؒ ۲) مفتی اسماعیل بسم اللہ صاحب ڈابھیلیؒ

۳) مولانا عبد الحئی بسم اللہ صاحب ڈابھیلیؒ ۴) قاری بندۂ الٰہی صاحب ایٹالوی

۵)مولوی ابراہیم صاحب چنتامن
۶)مولانا احمد علی صاحب
۷)مولانا احمد سعید صاحب بیرا
۸)مولانا فضل الرحمن صاحب
۹)مولانا آدم صاحب پالنپوریؒ
۱۰)مولانا خیر الرحمن صاحب
۱۱)مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقیؒ

علمی استعداد

استاذِ محترم نے انتہائی محنت وجاں فشانی سے علم حاصل کیا، اسی محنت کا ثمرہ تھا کہ آپ کو عظیم الشان تاریخی ادارے جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل سملک میں خدمت کا موقع حاصل ہوا۔ ان سطور کی ترتیب کے وقت بہت کوشش کی گئی کہ آپ کے نمبرات تلاش کرکے کتاب کی زینت بنائے جائیں؛ تاکہ اس سے زمانۂ طالبِ علمی کے احوال، محنت وجاں فشانی اور علمی قابلیت معلوم ہوسکے، لیکن نہ مل سکے، قدّر اللہ ماشاء، قرائن گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً استاذِ محترم درسگاہ کی صفِ اول کے طلبہ میں سے رہے ہوں گے۔

فراغت

استاذِ محترم کی فراغت ۱۳۸۰ھ میں ہوئی، اُس سال معمول کے مطابق جلسۂ دستار بندی کا انعقاد ہوا، جس میں صدارت کا سہرا حضرت مولانا سعید صاحب راندیریؒ مہتمم جامعہ حسینیہ راندیر سورت کے سر باندھا گیا۔ صبح آٹھ بجے جلسہ شروع ہوا، رات ہی میں دور دراز سے تشریف لانے والے مہمان آچکے تھے،

قراءت و نظم کے بعد مہتممِ جامعہ حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگؒ نے رپورٹ سنائی، پنڈال ناظرین و سامعین سے بھرا ہوا تھا، پھر استاذِ محترم کے ساتھ دیگر نو فارغین فضلا کی دستار بندی عمل میں آئی، انعامات اور سندیں تقسیم ہوئیں اور بعدہٗ مہمانِ خصوصی حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہجہاں پوریؒ نے ''سیرت'' کے موضوع پر پُرلطف اور سحرآفریں وعظ فرمایا اور دعا پر جلسہ ختم ہوا۔

فراغت کے بعد لکھنو میں

استاذِ محترم حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحبؒ نے فراغت کے بعد لکھنو کی جانب رختِ سفر باندھا، اس سفر کا تذکرہ طلبہ کے درمیان بھی کیا کرتے تھے،لیکن آپ کی حیات میں یہ بات معلوم نہ ہوسکی کہ یہ سفر کس غرض کے لیے کیا گیا تھا؟ آخر جب استاذِ محترم ہمیں داغِ مفارقت دے گئے اور راقم الحروف نے حالات یکجا کرنے کے لیے اہلِ خانہ سے اس سفر کے متعلق دریافت کیا،تب معلوم ہوا کہ وہاں تقریباً دو مہینے کسی بزرگ کی خدمت میں گزارے تھے۔

جامعہ میں تقرر

استاذِ محترم لکھنو کا سفر مکمل کر کے اپنے گھر واپس تشریف لے آئے،شوال ہی کا مہینہ تھا،طلبا کے لیے مدارس کے دروازے وا ہو چکے تھے،دوسری طرف مہتمم حضرات مدارس میں آنے والے طلبا کی علمی پیاس بجھانے اور ان کو زیورِ تربیت سے آراستہ کرنے کے لیے اساتذہ کا تقرر بھی فرما رہے تھے۔ جامعہ میں بھی کچھ

اساتذہ کی ضرورت تھی، اُس وقت جامعہ کے مہتمم باکمال وباصلاحیت، جوہر شناس اورمردم ساز حضرت اقدس مولانا محمد سعید صاحب بزرگ سملکیؒ تھے جنہیں حضرت مولانا ابوبکر صاحب غازی پوریؒ نے کچھ اس طرح سے یاد کیا تھا:

اس چمن کے ہیں مالی محمد سعید		نام ان کا سعید اور واقعی سعید
اللہ رکھے یہاں اور وہاں بھی سعید		کررہے ہیں فدا جان اور اپنا تن

ان کی نظرِ انتخاب ۱۴۰۸ھ میں ان شخصیات پر پڑی: قاری رمضان صاحب میواتی، مولانا قمرالدین صاحب بڑودی، حافظ ابراہیم بسم اللہ صاحب اور مولانا رشید احمد کیات صاحب۔ چنانچہ ان چند اشخاص کی رفاقت میں استاذِ محترم نے ۵۵/روپے کی ابتدائی تنخواہ کے ساتھ اپنی تدریسی خدمات کا آغاز فرمایا اور عجیب اتفاق ہے کہ اپنی زندگی کے ''پچپن'' ہی سال تدریسی خدمات میں گزار کر واصل بحق ہوئے۔

نکاح

استاذِ محترم کا نکاح ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں آمنہ بنت محمد نامی سعادت مند خاتون سے طے پایا، اُس وقت آپ جامعہ ڈابھیل کے زمرۂ اساتذہ میں شامل ہوچکے تھے۔ استاذِ محترم کی اہلیہ محترمہ ''شیخ'' خاندان کی چشم وچراغ، انتہائی تہذیب یافتہ اورسلیقہ مند ہیں، ہمہ وقت ذکر وتلاوت میں مشغول رہتی ہیں۔ ہمیشہ شوہرِ نامدار کا بہت زیادہ خیال فرماتی تھیں، ان کے منشا کے مطابق

کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنا، اولاد کی تعلیم وتربیت پر توجہ، مہمانوں کا خصوصی پاس ولحاظ رکھنا، اسی طرح طلبا جب آپ کے گھر کسی ضرورت سے جاتے تو کھانے اورناشتے کی پیشکش کرنا وغیرہ گوناگوں اوصاف کی حامل ہیں۔

استاذِ محترم بھی اپنی اہلیہ محترمہ کا بہت خیال فرمایا کرتے تھے۔ایک موقع سے کسی صاحب نے استاذِ محترم کو دعوت دی، آپ نے دعوت تو قبول کرلی؛ لیکن جب کھانے کے لیے بیٹھے تو ایک طالبِ علم کے ذریعے میزبان کی اجازت سے اپنے حصہ میں سے کچھ کھانا گھر بھیجا اور کہا خالہ سے کہنا: ''پہلے آپ چکھو! پھر میں کھاؤں گا''۔

اولاد

استاذِ محترم کی کل بارہ اولاد ہوئیں، جن کی قدرے تفصیل سپردِ قرطاس ہے: صاحبزادے کل ۹ ر ہیں: ۱) حافظ اسماعیل (۲) حنیف بھائی (۳) حافظ اسلم (۴) حافظ عباس (۵) حافظ سلیمان (۶) حافظ انور (۷) حافظ محمد (۸) ابراہیم بھائی (۹) یوسف بھائی۔

صاحبزادیاں کل تین ہیں: (۱) فاطمہ بیگم (۲) سلمہ بیگم (۳) رابعہ بیگم۔

دادی امّاں (استاذِ محترم کی اہلیہ جن کو ہم خدام ''دادی امّاں'' کہا کرتے ہیں) کا بیان ہے کہ: ''استاذِ محترم نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کے لیے بہت زیادہ مشقت اٹھائی اور زندگی کے کئی سال اولاد کی خاطر قربانیاں برداشت کیں؛

حتیٰ کہ اسکول وغیرہ کی تعلیمی فیس کے خاطر کھیتوں میں کام کیا‘‘۔ باری تعالیٰ نے اس محنت کو قبول فرما کران تمام بچوں کو والدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنادیا۔ جب استاذِ محترم اولاد کی دینی تربیت سے مطمئن ہوئے تو ترتیب وار یکے بعد دیگرے اپنے فرزندوں کو بیرون ممالک روانہ کیا اور تمام اولاد کی ہندوستان اور بیرون ملک مناسب جگہ اپنی حیات ہی میں شادیاں کروادیں۔ چنانچہ تین لڑکے اور ایک لڑکی لندن میں مقیم ہیں:

(۱) حافظ اسماعیل صاحب (۲) حافظ سلیمان صاحب (۳) حافظ انور صاحب (۴) رابعہ بیگم

اور تین لڑکے اور ایک لڑکی افریقہ میں مقیم ہیں:

(۱) حافظ عباس صاحب (۲) حافظ محمد صاحب (۳) ابراہیم بھائی (۴) فاطمہ بیگم

اور تین لڑکے اور ایک لڑکی استاذِ محترم کے وطنِ عزیز ڈابھیل ہی میں مقیم ہیں: (۱) حنیف بھائی (۲) حافظ اسلم صاحب (۳) یوسف بھائی (۴) سلمہ بیگم۔

ایک لطیفہ

قاری شبیر صاحب نرولی (مدظلہ) (استاذ جامعہ ہذا) کے حوالہ سے یہ بات منقول ہے کہ: ’’مولانا کا مزاج بڑا ظریفانہ تھا، آپ کی تقریباً بارہ اولاد تھی، اگر کوئی پوچھتا: مولانا آپ کی کتنی اولاد ہیں؟ تو ہنس کر فرماتے: کون گنتا ہے وہ تو ہوتی رہتی ہیں‘‘۔ لیکن قاری صاحب فرماتے ہیں کہ:: ’’سب کی اچھی تربیت

فرمائی جس کی وجہ سے ہر ایک اپنی جگہ اچھا کام کر رہا ہے"۔

ذریعۂ معاش

تدریس کی گراں قدر مصروفیات کے علاوہ ذریعۂ معاش کے طور پر استاذِ محترم خود کاشتکاری فرماتے تھے۔ طبقۂ اہلِ علم لیے بڑی عبرت کی بات ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اہلِ علم ہیں، ہماری اپنی ایک شان ہے، اس لیے پڑھنے پڑھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کریں گے۔ جہاں اسلام نے ہمیں عبادات کا مکلّف بنایا ہے وہیں اپنی طبعی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے رزقِ حلال کی تلاش وجستجو کی ترغیب بھی دی ہے؛ اس لیے ضرورت کے مواقع پر کسبِ حلال کے لیے ذرائعِ معاش اختیار کرنے میں چنداں عار محسوس نہیں کرنا چاہیے۔

استاذِ محترم اس معاملے میں بالکل پیچھے نہیں ہٹے اور کسی قسم کی کوئی شرم محسوس نہیں کی، بلکہ خوب محنت کر کے اپنے گھریلو فرائض نبھاتے رہے، اور زندگی بھر کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔

نیز غضب یہ ہے کہ کھیت میں کام کرنے کی وجہ سے درس وتدریس میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے متعلق حضرت قاری شبیر صاحب نرولی مدظلّہ لکھتے ہیں کہ: "مولانا کا ابتدائی زمانہ تنگی والا تھا، ہم نے خود دیکھا: مولانا کھیت کے سارے کام خود فرماتے تھے، ظہر کے بعد کھیت کا سامان پھاوڑا وغیرہ کھیت کے پاس رکھ کر درسگاہ میں آتے تھے، پھر درس مکمل کر کے دوبارہ کھیت کا رخ فرماتے،

نہ درس میں کوئی فرق پڑتا اور نہ مدرسہ کا کوئی قانون ٹوٹتا۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلّہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے مولانا کو کئی مرتبہ دیکھا کہ آپ کھیت میں سائیکل پر پھاوڑا لیے جارہے ہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب کھیت میں بہت سارا کام ہوتا تو مولانا صبح کے چار گھنٹے مکمل کر کے سیدھے کھیت میں چلے جاتے اور پھر دوبارہ ظہر کے بعد مدرسہ ہی میں آجاتے اور اسی حالت میں پڑھاتے۔ کتنی مرتبہ تو ایسا ہوتا کہ آپ کے کپڑے مٹی سے اَٹے ہوتے؛ لیکن آپ بالکل شرم محسوس نہ کرتے۔

استاذِ محترم حضرت مفتی عرفان صاحب مدظلّہ نے کیا ہی پیارے انداز میں آپؒ کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے، آپ لکھتے ہیں: ۵۰/ سال سے زائد عرصہ تک تقریباً روزانہ کا معمول تھا، ایک شخص صبح صبح مدرسہ میں داخل ہوتے، کاندھے پر کدال، پائجامے کا پائنچہ گھٹنوں کے قریب تک چڑھا ہوا، چھوٹی چھوٹی چمکدار آنکھیں، کُرتے میں سینے کے دائیں بائیں دو جیب، دونوں جیبوں میں ڈھیر ساری رنگ برنگی قلمیں ٹھونسی ہوئیں، گیٹ کے پاس پانی کے نل سے کدال پھاوڑا دھوتے، ہاتھ پیر اور چپلوں سے کیچڑ مٹی کو دھو کر صاف کرتے، بھیگا ہوا پائنچہ نیچے اتارتے اور زوردار آواز میں سلام کر کے درسگاہ میں داخل ہوتے، نظر جھکائے جھکائے مسند پر بیٹھتے اور فوراً بآوازِ بلند یٰسین شریف کی تلاوت شروع کر دیتے، اذکار و اوراد سے فارغ ہوتے ہی ٹپائی پر اپنا فولادی ہاتھ مارتے اور آواز لگاتے:

’’چلو سبق سنانے کے لیے آجاؤ‘‘۔

طلبہ کی تو جیسے شامت آجاتی، مگر چاروناچار سبق سنانے کے لیے اٹھنا ہی پڑتا، ان کی ٹپائی سے ذرا دور ہٹ کر سبق سنانے کا عمل شروع ہوتا، اور ان کی جانب سے حوصلہ افزائی کے کلمات بلند ہوتے، شاباش..... بہت اچھے..... ٹھیک ہے..... چلتے رہو..... آگے چلو..... بسا اوقات وجد میں آکر سبق سنانے والے طالبِ علم کی آواز سے آواز ملا کر خود بھی پڑھنے لگتے، اور جیسے ہی انہوں نے پڑھنا شروع کیا، بس! سمجھ جایئے کہ اس طالبِ علم کی سبق کی نیّا پار لگ گئی؛ اس لیے کہ اب اگر طالبِ علم بھول کر رک بھی جائے تو مولانا کی آواز نہ رُکتی اور خود ہی آگے آگے پڑھتے چلے جاتے اور طالبِ علم ان کے پڑھے ہوئے کو دوہراتے چلا جاتا، اور منتہائے سبق پر جا کر سلسلہ رک جاتا۔ اب دوسرے کی باری آتی، وہ بہت پُرزور انداز میں بسم اللہ پڑھ کر سبق شروع کرتا اور تھوڑی ہی دیر میں حضرت کو اندازہ ہوجاتا کہ طلبہ کو سبق یاد ہے، بس پھر کیا..... ٹپائی پر ہاتھ مارتے اور انگلی سے دائرہ کا اشارہ کرتے ہوئے فرماتے: ’’حلقہ بنا کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے کو سبق سنادو‘‘۔

دیکھنے والے حیران رہ جاتے کہ ابھی تو یہ شخص ایک عام سا کسان دکھائی دے رہا تھا اور اب آناً فاناً جامعہ ڈابھیل جیسی عظیم الشان درسگاہ کی مسندِ درس پر جلوہ افروز ہے۔ یہ کسان اور کاشتکار ہے یا عربی کا مدرّس؟ جی ہاں! یہ ہیں جامعہ

ڈابھیل کے عاشق زار، اپنا سب کچھ جامعہ پر نثار کر دینے والے بے لوث خادم حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب۔

جامعہ کے کتب خانہ میں آپ کا کردار

جامعہ کا اپنا ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے جس میں مختلف علوم وفنون کی الگ الگ زبانوں میں تقریباً تیس ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں، ان میں بعض کتب بہت نادر ہیں، مخطوطات اور نادر کتابوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ہر سال کتابوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ کتب خانہ اِس اطراف میں جامعہ ہی کی طرح بے نظیر ہے۔ پہلے تین بڑے کمروں میں کتابیں رکھی جاتی تھیں، بعد میں ایک وسیع وعریض عمارت بنا کر کتب خانہ اس میں منتقل کر دیا گیا۔ اس عظیم کتب خانے کا نظم ونسق سنبھالنا بھی بڑی ذمہ داری کا کام ہے، استاذِ محترم کو اس ''کوچۂ نظامت'' میں بھی خدمت کا موقع ملا، آپ نے اس کا بہت عمدہ انداز میں نظم ونسق فرمایا، ہر کتاب کو اس کی جگہ رکھنا، کتابوں کی دیمک وغیرہ سے حفاظت کرنا اور صفائی کا خیال رکھنا، اساتذۂ کرام وطلبا کو عاریت پر کتابیں پڑھنے کے لیے دینا اور وقتِ مقررہ پر جمع کرنا، اور کتب خانہ کی دیگر ذمہ داریوں: امتحانات، نتائجِ امتحانات وغیرہ کو پورے ذوق وشوق اور اہتمام ولگن سے نبھانا، آپ کی گراں قدر خدمات کا ایک حصہ ہے۔

مکاتبِ قرآن اور آپؒ

۱۳۸۱ھ میں جامعہ کی شوریٰ نے از سرِ نو تنظیمِ مکاتب کی تجویز پیش کی، یعنی مکاتب کی تعلیم میں ترقی، ہم آہنگی اور کامل افادیت پیدا کرنے کے لیے مختلف دیہاتوں کے مکاتب کو ملحق کرلیا گیا، اوران کے ذمہ داروں سے کہا گیا کہ: جامعہ ان کی تعلیمی رہنمائی کرے گا، امتحانات کے لیے جامعہ سے اساتذہ بھیجے جائیں گے، وہ امتحانات کے بعد جو خامیاں ہوں گی ان کی نشان دہی کریں گے۔ اولاً سات مکاتب سے یہ سلسلہ شروع ہوا، پھر دھیرے دھیرے تعداد بڑھتی گئی، اور کمّیت کے بڑھنے کے ساتھ کیفیت بھی نکھرنے لگی۔

اس کمّیت و کیفیت کی عمدگی میں استاذِ محترم کا بڑا کردار رہا، بالآخر آپ کو اس کا ''ناظم'' بنادیا گیا، آپؒ نے بہت ہی عمدہ طریقے سے اس منصب کو سنبھالا، اکثر ہم نے دیکھا کہ دفتر سے آپ کے نام ایک خط آتا، جس میں متعینہ مکاتب کے امتحانات کے نظم و انتظام کا حکم ہوتا، لیکن آپؒ ہمیشہ اس رسمی تحریر کے آنے سے پہلے ہی تیاری شروع فرمادیتے، جن اساتذہ کو اپنے ہمراہ لے جانا ہوتا، ہر ایک کے نام جدا جدا رقعہ تیار کرتے جس میں پوری تفصیل مذکور ہوتی، اس کی ایک جھلک استاذِ محترم کے ہاتھوں لکھے ہوئے مذکورہ رقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے:

محترم جناب قاری محفوظ الرحمن ہانس صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں!

بعد از سلام! معلوم ہو کہ حسبِ سابق مندرجۂ ذیل مدرسہ کا سالانہ امتحان بہ مطابق تاریخِ مذکور متعینہ وقت پر لے کر مشکور فرمائے اور امید ہے کہ دعاؤں میں یاد فرماتے رہیں گے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

تفصیل: مدرسہ مصباح العلوم، جھنڈا چوک، جمعہ مسجد واپی، مورخہ ۲۸/ ۶/ ۲۰۱۲ء بہ روز: جمعرات، بہ وقتِ صبح۔

نوٹ: فلائنگ رانی ٹرین سے ہی روانہ ہونا ہے۔ خیر! جو بھی مناسب سمجھیں، مولانا محمد سعید دمنی اور مولانا مفتی عبد المجید کولواوی کے ہمراہ۔

کتبہ: رشید احمد کیات عفی عنہ

۹/ ۶/ ۲۰۱۲ء

مکاتب کو فروغ دینے کے لیے شاگردوں کی بات پر عمل

استاذِ محترم ناظمِ مکاتب ہونے کے باوجود حضرات اساتذۂ کرام جو درخواست کرتے اس کو خوشی سے قبول فرماتے اور اسی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش فرماتے، جس کی ایک نظیر استاذِ محترم کی اس تحریر میں جو آپ کے شاگرد قاری محفوظ الرحمٰن صاحب مدظلہ کے نام لکھی گئی ہے دیکھی جا سکتی ہے، جس میں استاذِ محترم نے قاری صاحب کی درخواست قبول فرماتے ہوئے لکھا کہ: ''قاری محفوظ الرحمٰن صاحب! آپ کے ارشادِ گرامی کے مطابق نوساری، مدرسہ تعلیم

الاسلام جامع مسجد میں ممتحن کی حیثیت سے مولانا عبدالمجید صاحب اور مفتی عبدالقیوم کڈی صاحب کے ساتھ، آپ کے نام کا بھی ان شاء اللہ تعالیٰ انتخاب عمل میں آئے گا‘‘۔

مکاتب کی خدمات کے بارے میں حضرت قاری شبیر صاحب نرولی مدظلّہ لکھتے ہیں کہ: ’’مولانا مجھے رقعہ بھیج کر اکثر امتحان کے لیے یاد فرماتے تھے، سال بھر کبھی تو ہم دونوں ہی ہوتے اور جب امتحان کے لیے کسی دیہات یا قریبی قصبہ میں جانا ہوتا تو بندے کی گاڑی پر چلے جاتے اور اگر دور جانا ہوتا مثلاً واپی وغیرہ تو فلائنگ رانی سے چلے جاتے، سفر کے دوران راستے میں لطائف وظرائف اور معنی خیز چٹکلے ارشاد فرماتے رہتے، جس سے سفر کی تھکان یا منزل کی دوری کا کبھی احساس نہ ہوتا اور مکاتب کے فروغ کے لیے جس قسم کی رائے دی جاتی مولانا اسے خوشی خوشی قبول فرماتے‘‘۔

اسفار

استاذِ محترم ویسے تو اسفار کرنے سے بہت زیادہ احتیاط فرماتے تھے؛ لیکن عبادات یا فرائضِ منصبی کی ادائیگی یا رشتے داروں سے حسنِ سلوک وصلہ رحمی کے لیے اسفار سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے؛ چنانچہ استاذِ محترم دو مرتبہ حجِ بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے، اسی طرح آپ نے تین مرتبہ لندن کا سفر فرمایا، اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی بہت سی جگہ تشریف لے گئے، خصوصاً گجرات کے علاقہ

میں آپ نے مختلف دیہات اور قصبات کے اتنے سفر کیے جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔

اساتذۂ جامعہ کے ساتھ جب کبھی سفر ہوتا تو دلچسپ واقعات، معنی خیز اشعار اور مزاحیہ لطیفے سناتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے: استاذِ محترم پندنامہ کا درس دے رہے تھے، اسی اثنا میں فرمانے لگے: ایک مرتبہ میں مفتی محمود صاحب بارڈولی کے ساتھ واپی سفر میں جارہا تھا، مفتی صاحب ڈرائیور کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے، اور میں درمیانی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، گاڑی ہواؤں سے باتیں کر رہی تھی، اچانک ایک موٹر سائیکل والا اپنے پیچھے ایک ساتھی کو بٹھائے ہوئے بہت تیزی سے ہماری گاڑی کے بالکل قریب سے گذرا، ہم قدرے گھبرا گئے، چونکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دونوں جوان ہماری گاڑی سے ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر جائیں گے! اس موقع پر میں نے مفتی محمود صاحب سے کہا: گھبراؤ نہیں، اللہ خیر کا معاملہ کرے گا تو مفتی صاحب نے کہا: مولانا! اس موقع پر کوئی شعر سنادو، میں نے کہا: ارے بھائی جانے دو؛ لیکن جب اصرار بڑھ گیا تو میں نے یہ شعر کہا:

اے جوانی پے مرنے والے! جوانی تو جانے والی ہے
جس کو تو شربت سمجھتا ہے وہ تو صرف رنگین پانی ہے

اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے اشعار اور لطائف وظرائف ہیں جو سفر کے دوران استاذِ محترم ارشاد فرماتے، ان شاء اللہ ’’بابِ دوم‘‘ میں ان کا ذکر آجائے گا۔

درسیات

استاذِ محترم نے جامعہ کے مختلف شعبہ جات کی خدمات کے ساتھ درسیات میں بھی عمدہ کردار ادا کیا، چنانچہ اولاً آپ نے درجۂ حفظ میں چند سال خدمات انجام دیں، پھر درجۂ اردو دینیات آپ کے سپرد ہوا، درجۂ اردو دینیات میں آپ کے زیرِ درس مذکورہ کتب تھیں:

(۱) اردو عربی قاعدہ (۲) اردو کی پہلی (مؤلفہ مولانا اسماعیل صاحب میرٹھیؒ)
(۳) تعلیم الاسلام (۱/۲) (۴) رسولِ عربی (۵) خلافتِ راشدہ (۱/۲) (۶) بہشتی ثمر (۱/۲)

درجۂ فارسی اول میں آپؒ کے زیرِ درس درجِ ذیل کتب تھیں:

(۱) سیرت خاتم الانبیاء (۲) آمدن سی لفظی (۳) اردو کی دوسری (۴) رہبرِ فارسی (۵) حکایتِ لطیف (۶) تیسیر المبتدی (۷) کریما سعدی (۸) پندنامہ

درجۂ فارسی دوم میں آپ کے زیرِ درس یہ کتابیں تھیں:

(۱) مفتاح القواعد (۲) گلستاں (۳) بوستاں (۴) مالا بدمنہ (۵) اردو کی تیسری (۶) تاریخ اسلام

درجۂ عربی اول میں آپؒ کے زیرِ درس مختلف سالوں میں مذکورہ کتب رہیں:

(۱) کتاب الصرف (۲) نحو میر (۳) شرح ماۃ عامل (۴) القراءۃ الواضحہ [اول، دوم] (۵) میزان و منشعب (۶) کتاب النحو (۷) القراءۃ الراشدہ [اول، دوم]

(۸) مفتاح القرآن [اول، دوم] (۹) علم الفقہ [اول] (۱۰) عربی صفوۃ المصادر

تلامذہ

استاذِ محترم کی شخصیت سے اکتسابِ فیض کرنے والے طلبہ کی تعداد اتنی کثیر مقدار میں ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ ہندو بیرونِ ہند میں اکثر مقامات پر بالواسطہ یا بلا واسطہ آپ کا کوئی نہ کوئی علمی فرزند موجود ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خود حضرت استاذِ محترم کو کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ جب کوئی مدتوں کے بعد استاذِ محترم سے ملنے کے لیے آتا تو یوں کہتا کہ حضرت! پہچانا؟ استاذِ محترم فرماتے: نہیں۔ تو وہ کہتا: میں فلاں جگہ کا رہنے والا ہوں، اور آپ سے یہ درجہ پڑھا ہوں۔ استاذِ محترم کہتے: یقیناً آپ میرے پاس پڑھے ہوں گے؛ لیکن شاگردوں کی تعداد ہی اتنی ہوگئی ہے کہ مجھے خود معلوم نہیں کہ کون کہاں سے آیا اور کس نے کونسا درجہ پڑھا۔

اس سلسلے میں آپؒ کے شاگرد حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب مدظلّہ (صدرالمدرس جامعہ خیر العلوم ادگاؤں) رقم طراز ہیں کہ: ’’پچپن سالہ تدریسی دور میں اَن گِنت طالبانِ علومِ نبوت نے اس چشمۂ علم ومعرفت سے فیض یابی کی جو ملک و بیرونِ ملک دینِ اسلام کی حفاظت واشاعت کا خوشگوار فریضہ انجام دے رہے ہیں، حتیٰ کہ خود جامعہ ہی میں حضرت والا کے شاگردوں؛ بلکہ شاگردوں کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد مشغولِ خدمت ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ علم وعرفان کا کیسا دریا ہوگا جس کے یہ قطرے بمصداق اپنی اصلِ ثابت

کے عمدگی و جودت کی شہادت دے رہے ہیں“۔

نیز آپ کے ایک اور شاگرد خاص مولوی عبید اللہ صاحب بارڈولی مدّظلہ (ناظمِ جامعہ دار الاحسان نواپور) لکھتے ہیں کہ: ”استاذِ محترم کو پڑھانے اور دین کی خدمت کرنے کا بہت شوق تھا، احقر کے والدِ محترم (حاجی احمد حافظجی صاحب) بھی آپ کے پاس پڑھے ہیں، ایک مرتبہ استاذِ محترم نے فرمایا، عبید اللہ! تیرے والد بھی میرے پاس پڑھے ہیں تو بھی میرے پاس پڑھتا ہے، دعا کر کہ تیرے بچے بھی میرے پاس پڑھے“۔

ذیل میں استاذِ محترم کے ان تلامذہ کے نام لکھے جا رہے ہیں جو راقم کے علم میں آپ سے بہت زیادہ تعلق رکھتے تھے، اور طویل مدت سے اپنے اپنے علاقے میں مدارس اور مکاتب کی خدمات میں مشغول ہیں:

(۱) حضرت اقدس مفتی عباس صاحب ڈابھیلی دامت برکاتہم (صدر مفتی جامعہ ڈابھیل)

(۲) حضرت مفتی عبد اللہ صاحب رویدروی دامت برکاتہم

(۳) حضرت مولانا سلیمان صاحب چوکسی دامت برکاتہم (استاذ حدیث دار العلوم زکریا، افریقہ)

(۴) مولانا اسماعیل صاحب کاپودرا (ناظمِ تعلیمات نورانی مکاتب)

(۵) مولانا سعید ابن حافظ احمد پٹیلؒ مدظلّہ (مقیم لندن وسرپرست مدرسہ

دعوۃ الایمان ٹکولی)

(۶) مولانا عبدالحق بورسدی دامت برکاتہم (صدر جمعیۃ علماء، بورسد)

(۷) حضرت مولانا اسماعیل صاحب پانڈور سملکی دامت برکاتہم (استاذ جامعہ ڈابھیل)

(۸) حضرت مولانا عثمان صاحب تیلاڑا (استاذ جامعہ ڈابھیل)

(۹) مولانا سعید احمد حبیب صاحب کشمیری مدظلہٗ (مدیر ماہنامہ فکر ونظر)

(۱۰) حضرت مفتی عرفان احمد صاحب مالیگانوی مدظلہٗ (استاذ جامعہ ڈابھیل)

(۱۱) حافظ نعیم الرحمن صاحب اورنگ آبادی مدظلہٗ

(۱۲) قاری محفوظ الرحمن صاحب ڈابھیلی مدظلہٗ (استاذِ قراءت جامعہ ڈابھیل)

(۱۳) عاشق جامعہ ڈابھیل قاری یوسف بھولا صاحب دامت برکاتہم (امام وخطیب وداعی امریکہ)

(۱۴) حضرت مولانا بشیر صاحب اورنگ آبادی دامت برکاتہم (مقیم ڈابھیل)

(۱۵) مولانا رفیع الدین اونوی دامت برکاتہم (استاذ جامعہ ڈابھیل)

(۱۶) مفتی یوسف صاحب ہانس دامت برکاتہم (استاذ جامعہ ڈابھیل)

(۱۷) قاری امین الدین صاحب اورنگ آبادی مدظلہ (ناظمِ تعلیمات مدرسہ یکخانہ اورنگ آباد)

(۱۸) قاری ہاشم صاحب ڈابھیلی مدظلہ (استاذ جامعہ ڈابھیل)

(۱۹) مولانا امتیاز صاحب مدظلّہ (مقیم لندن)

(۲۰) مفتی شاہد ابرا مدظلّہ (شیخ الحدیث، دمن)

(۲۱) مولانا ابراہیم صاحب مظاہری (مہتمم جامعہ قاسمیہ کھروڈ)

یہ تو نمونے کے طور پر مشتے از خروارے چند شاگردوں کے نام لکھ دیے گئے، ورنہ آپ کے شاگردوں اور خوشہ چینوں کی فہرست نہایت طویل ہے، تمام شاگردوں کا نام لکھ لینا نہ ممکن ہے اور نہ اِس مقام پر مناسب، لیکن اس ربِّ علیم و خبیر کے علم سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں، وہ خوب جانتا ہے کہ اس وقت استاذِ محترم کے کتنے شاگرد دنیا کے مختلف خطوں میں دین کی خدمت انجام دے کر استاذِ محترم کے لیے صدقہ جاریہ بنے ہوئے ہیں۔

نوٹ: یاد رہے کہ یہاں تمام مشہور شاگردوں کا احصا مقصود نہیں اور نہ ہی راقم کو اس کا دعویٰ ہے، بس! صرف آپ کے جلیل القدر تلامذہ کی ایک جھلک دکھلانی مقصود تھی۔

حسنِ انتظام

استاذِ محترم کی خدمات، آپ کی تگ ودَو اور کارناموں کی مقبولیت و پذیرائی دیکھ کر آپ کے حسنِ تدبُّر اور قوتِ نظم و نسق کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آپ کے نظم و نسق ہی کا نتیجہ تھا کہ جامعہ نے آپ کو تدریسی خدمات کے علاوہ جامعہ سے متعلق دیگر خدمات کے لیے منتخب کیا، جن میں آپ نے امید سے بڑھ کر

کارہائے نمایاں انجام دیے، حسنِ انتظام کے سلسلے میں ہمیشہ آپ کے گیت گائے جاتے تھے اور اب بھی گائے جارہے ہیں۔

آپ کے حسن انتظام کی ایک جھلک مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کی زبانی ملاحظہ فرمائیے، فرماتے ہیں کہ: ''آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی حسنِ انتظام کا بڑا خیال فرماتے، اگر کہیں سفر پر جانا ہوتا تو بالتفصیل سمجھاتے کہ اتنے بجے ویسما جانا ہے، وہاں فلاں وقت فلاں گاؤں کے لیے بس روانہ ہوگی، ہمیں وقت سے پہلے وہاں پہونچنا ہے، پھر وہاں جاکر اس طرح کام کرنا ہے۔غرض یہ کہ بالتفصیل ہر ایک چیز بتاتے، جس سے کسی بھی کام میں افراتفری یا بدانتظامی نہ ہوتی، اور ہر کام نہایت مرتب اور سلیقے کے ساتھ انجام پاتا''۔

نیز حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''آپ کے اوصاف میں حسنِ انتظام کی خوبی ایک نمایاں مقام رکھتی ہے''۔

جامعہ کے لیے مالی فراہمی کی فکر

استاذِ محترم نے ذاتی اغراض و مفاد سے صرفِ نظر کرکے اپنی ملّی خدمات میں ایک ایسا کام انجام دیا، جو ہر کس و ناکس کے بس کا نہیں، آخر تصور تو کیجیے! لوگوں کے سامنے اوروں کے لیے جھولیاں پھیلانا، اور شہر شہر، بستی بستی، محلّہ محلّہ؛ بلکہ گلی گلی دیوانہ بن کر گھومنا، کون پسند کرتا ہے!! یقیناً یہ کام ایک مخلص آدمی اور اپنے پرائے کا غم کھانے والا ہی انجام دے سکتا ہے۔آپ جامعہ کے دھان

(چاول) کے چندہ کے خاطر اس طرح بلا چوں و چرا ہشاش بشاش ہوکر چلے جاتے جیسے لوگ ذریعۂ معاش کی جستجو میں بلا چوں و چرا چلے جاتے ہیں۔ صدآفریں ہو آپ کے جذبۂ اخلاص پر! کہ آپؒ کسی چیز کی پرواہ کیے بغیر طالبانِ علومِ نبوت کے لیے ڈگر ڈگر، نگر نگر دیوانہ وارگشت کرتے رہے، اگر یوں کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ زمین اگر ان کے نقوشِ قدم محفوظ رکھتی تو وہ بھی آپ کی پامردی واستقلال کی گواہی دیتے۔

اس سلسلے میں قاری یوسف صاحب بھولا (الملقب بہ جامعہ ڈابھیل) رقم طراز ہیں کہ: ''میں نے رمضان کی تعطیلات کے موقع سے اطراف واکناف میں چاول وصول کرتے ہوئے بارہا حضرت الاستاذ اور حافظ فرڑیا صاحب کو دیکھا ہے''۔

نیز مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلّہ فرماتے ہیں کہ: ''دھان کے چندہ کے علاوہ نقد روپیوں کی شکل میں بھی چندہ کرتے، اور اس سلسلے میں دمن، واپی، بلساڑ دور دور تک کے علاقوں میں جاتے، وانکانیر کے قریبی دیہاتوں سے بھی جامعہ میں چندہ وغیرہ آتا ہے، آپؒ ہر ایک کو شکریہ کا خط روانہ کرتے، اور ان کی خوشی وغمی کے موقع پر ان کے گھر جانا، خیر خیریت معلوم کرنا آپؒ کے نمایاں اوصاف میں سے تھا''۔

آپ کے انتظام کے سلسلہ میں قاری شبیر صاحب مدظلّہ رقمطراز ہیں کہ:

''دھان کے چندے کے لیے مولانا مرحوم اطراف کے قصبوں اور دیہاتوں میں پہلے ہی سے خط روانہ کردیتے تھے، پھر وصول یابی کے لیے آپؒ ازخود تشریف لے

جاتے تھے‘‘۔

اس کی وضاحت کے لیے وہ چشمِ دید داستان سنیے کہ جس کا تذکرہ رقّت آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ عبرت انگیز بھی ہے، داستان کچھ اس طرح ہے: استاذِ محترم گھر کی ایک چائے اور کچھ ہلکا ناشتہ کر کے پڑھانے کے لیے مدرسہ تشریف لے آتے، اچانک دفترِ اہتمام کا فرستادہ استاذِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عرض کرتا کہ ابھی مدرسہ کے چندے کے لیے جانا ہے، استاذِ محترم فوراً کہتے: ٹھیک ہے۔ چوتھا گھنٹہ ختم ہونے کے قریب ہوتا تو استاذِ محترم اپنا دستی بیگ لیے ہوئے فوراً مطبخ کے پاس پہنچ جاتے، اور اپنے ہمراہ معاونین کو لے کر کھانے اور آرام کی پرواہ کیے بغیر قریہ قریہ، محلہ محلہ گشت کر کے وافر مقدار میں جامعہ کی گاڑی میں سارا غلہ لاد کر لے آتے، جب مدرسے میں تشریف لاتے تو اس وقت سورج پورے جوش کے ساتھ اجلی دوپہر کی کرنیں بکھیر رہا ہوتا، اور مہمانانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نیند مکمل کر کے مسجد کی طرف نمازِ ظہر ادا کرنے جا رہے ہوتے، استاذِ محترم مسجد کے صحن سے طلبہ کے چہروں کو دیکھ دیکھ کو اپنی تھکان کو دور کرتے اور مسکراتے ہوئے گذر جاتے، اور کبھی ایک حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے؛ کیوں کہ آپ کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ مقصد رہتا تھا۔

یہی آرزو ہے کہ تعلیمِ قرآن عام ہو جائے
ہر پرچم سے اونچا اسلام کا پرچم ہو جائے

دھان کے چندے کے سلسلے میں مولانا بشیر صاحب اورنگ آبادی مدظلّہ
۔جو آپؒ کے پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ شاگرد بھی ہیں۔ فرماتے ہیں:
''حضرت الاستاذ ہمیشہ اپنا دستی بیگ ساتھ رکھتے اور موقع کا فائدہ اٹھا کر مدرسہ کی
مالی امداد کو اعلیٰ سے اعلیٰ تر بنانے کی فکر فرماتے''۔

آپ کے فرزندِ ارجمند حنیف بھائی کیات فرماتے ہیں کہ: ''ابّا جان اتنی
محنت سے چندہ جمع کرنے کا اہتمام فرماتے کہ آپ کی بار بار آمد ورفت سے غیر مسلم
بھی چندہ قبول کرنے کا تقاضا کرتے، اور اس خدمت کی وجہ سے آپ ہر جگہ مشہور
بھی ہو گئے تھے''۔

حضرت مولانا اسماعیل صاحب نوساری زیدمجدہ استاذِ محترم کا مقولہ نقل
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: استاذ مکرم فرمایا کرتے تھے کہ: ''پڑھنے کے زمانے
سے ہی اللہ تعالیٰ نے جامعہ کی خدمت کے لیے قبول فرمایا، ابتدا میں تو بیل گاڑے
میں نوساری جاتا اور پچاس روپیے میں بیل گاڑا بھر کر سامان لے آتا''۔اسی طرح
''دھان کے چندے'' میں تادمِ حیات انتہائی فعال بن کر خدمت انجام دیتے
رہے۔عمر میں سب سے زیادہ تھے؛ لیکن جوانوں سے زیادہ متحرک تھے۔

ایک مرتبہ راقم کی کالا کاچھا میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی، تو معلوم
ہوا کہ وہ استاذِ محترم سے واقف ہیں، میں نے تذکرہ چھیڑا تو کہنے لگے: میں ان کو
جانتا ہوں، وہ اکثر ہمارے یہاں دھان کے چندہ کے لیے آیا کرتے تھے۔

انتقال کے دوسرے سال جب اساتذۂ جامعہ اردگرد کے قصبات میں چندے کے لیے گئے تو ہر دیہات اور قصبہ کے لوگوں کو استاذِ محترم کا گرویدہ وفریفتہ پایا، اور دیکھا کہ ہر کوئی آپ کے حسنِ اخلاق اور محنت وجانفشانی کا معترف ہے۔

استاذِ محترم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ آپ نے اپنی ساری کی ساری تدریسی خدمات ایک جگہ استقامت کے ساتھ رہ کر انجام دی، اسی وجہ سے آپ جامعہ کے عالی مقام مدرّس ومربّی ثابت ہوئے، آپ نے اپنی شہرت، علمی چمک، تدریسی بہار اور زرکشی کی تلاش میں، اپنی خاک سے بے وفائی نہیں کی، اور جس سرزمین نے آپ کو علم وعمل کے زیور سے آراستہ کیا تھا اس کی بھرپور خدمت کو اصل فریضہ باور کیا اور تادمِ آخر اسی سے چمٹے رہے۔

بیواؤں کو رقومات ارسال کرنا

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کرۂ ارض پر ایسی بے شمار ہستیاں پیدا کی ہیں جنہوں نے خدمتِ دین کے لیے اپنے آپ کو مٹا دیا، استاذِ محترم کا شمار بھی انہیں باکمال ہستیوں میں تھا جنہوں نے اپنے مفاد کو بالائے طاق رکھ کر خدمات کے ایسے نقوش ثبت کیے جو ہر بے یار ومددگار کے لیے ایک سہارے کی حیثیت رکھتے تھے، پھر دنیا نے دیکھا کہ اس طرح کی خدمات کرنے والے رہتی دنیا تک انسانوں کے لیے نمونہ ویادگار بن کر دلوں میں سما گئے، اور تاریخ نے ان کو اپنے سینے میں جگہ دی۔

عن أبي هريرةؓ قال: قال رسول اللهﷺ: ”الساعي على الارملة والمسكين كالمجاهد في سبيل الله واحسبه قال: وكالقائم الذي لايقصر، وكالصائم لايفطر. (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی بیوہ اور مسکین کے لیے کوشش کرتا ہے (یعنی ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے) اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا۔ راوی کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ یہ بھی فرمایا: وہ آدمی ایسا ہے جیسا رات بھر نماز پڑھتا ہو اور تھکتا نہ ہو اور دن میں روزہ رکھتا ہو کبھی ناغہ نہ کرتا ہو۔

(بخاری، کتاب الادب: ح: ۶۰۰۷)

استاذِ محترم کا صرف یہی کمال نہ تھا کہ وہ متعلقہ اسباق وفنون پڑھا دیتے تھے، بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک اہم ذمہ داری جو آپ کو آپ کے بہتر نظم ونسق کی وجہ سے عطا کی گئی تھی وہ ”بیواؤں کی خدمت“ ہے۔ اس سلسلے میں بھی آپ کی بڑی عمدہ کارکردگی رہی۔ حضرت قاری شبیر صاحب فرماتے ہیں: ”گجرات کا شاید ہی کوئی شہر یا بستی خالی ہوگی، جہاں مولانا امتحان کے لیے یا چندے کے لیے یا بیواؤں کی مدد کے لیے یا معین مدرسین کو رقم دینے کے لیے نہ گئے ہو“۔

عبدالقادر بھائی پوسٹ مین گویا ہے کہ: ”مولانا رشید صاحب بیوہ عورتوں کا بہت خیال فرمایا کرتے تھے، میرے ہاتھوں اپنے پیسوں سے خط منگواتے اور

مکمل پتہ کے ساتھ پورے اہتمام سے پوسٹ میں میرے پاس بھیج دیتے، اور بسا اوقات کسی طالبِ علم سے بھی اس سلسلے میں کام لیا کرتے تھے، جو پوسٹ میں آ کر مولانا کی بتائی ہوئی تفصیل سنا جاتا، اور میں اس کے مطابق کام کر دیتا، بعد میں ملاقات پر پوری کارگزاری بھی لیتے، اور حسنِ کارکردگی پر حوصلہ افزائی فرماتے اور دعاؤں سے بھی نوازتے''۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''استاذِ محترم کو خدمت کا بہت شوق تھا، ہر لائن کی خدمت کے بارے میں آپ کا خیال ہوتا کہ میں کرلوں، اور ثواب حاصل ہوجائے۔ ایک مرتبہ ایک بیوہ کا بھائی میرے پاس آیا اور کہنے لگا: میری بہن کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اس لیے آپ میری بہن کی امداد فرمائیں، چونکہ بہت ہی غربت میں وہ زندگی بسر کررہی ہے، تو میں نے اسی وقت قاری مبین صاحب ماکھنگا کے پاس بھیجا جو اس کے ذمہ دار تھے، تو اولاً پچاس روپے شروع کروائے گئے اور یہ سلسلہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا، اب چونکہ قاری مبین صاحب اور ان کے بھائی قاری حسین صاحب مولاناؒ کے بہت ہی قریبی تھے، جب ان کے ذریعہ مولاناؒ کو اس کی اطلاع ہوئی تو مولانا نے اس خدمت کو اپنے ذمہ لے لیا اور کہا: ان شاء اللہ سارے کام میں کردوں گا، آپ مجھ تک فقط پیسے پہنچا دیا کریں۔ چنانچہ استاذِ محترم خود پوسٹ میں جا کر منی آرڈر کرتے، اور اس کی پوری تفصیل لکھ کر رسید کی شکل میں میرے گھر بھی دینے کے لیے آجاتے۔ میں

نے بار ہا کہا: استاذ! یہ کام تو آپ کسی طالبِ علم سے بھی کروا سکتے ہیں، آپ میرے استاذ ہیں، میں مناسب نہیں سمجھتا ہوں کہ آپ اس طرح تشریف لایا کریں، اس وقت استاذِ محترم جواب دیتے: چلے گا، کوئی حرج نہیں، یہ بھی تو دین ہی کا کام ہے"۔

شاعر نے سچ کہا ہے:

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

یعنی دل کو فکر منداور زندہ رکھنے کے لیے یہ داستانیں بھی پڑھ لیا کرو۔

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں		اس مختصر سی عمر میں کیا کیا کرے کوئی

یقیناً یہ استاذِ محترم کی جواں مردی تھی کہ آپ نے اس مختصر سی عمر میں نہ جانے خدمت کے کتنے راستوں پر عمل کر کے دکھلایا۔

حضرت مفتی عرفان احمد صاحب مالیگانوی مدظلہ آپ کی متحرک وفعّال زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "کاندھے پر خطوط اور کاغذات سے بھرا جھولا لٹکائے ہوئے بلا تکلف چلے جا رہے ہیں، جامعہ کے سارے مخیّر حضرات چاہے ہند کے ہوں یا بیرونِ ہند کے، سب کو شکریہ کے خطوط لکھنا، گاؤں گاؤں پہنچ کر طلبہ کے لیے غلّہ جمع کرنا، مکاتب کے امتحانات کا نظم کرنا، رپورٹ پیش کرنا، سبق پڑھانا، سبق سننا، بازار سے گھریلو سامان لانا، کبھی بس میں، کبھی بیل گاڑی پر، کبھی ٹرین میں، غرضیکہ نقل وحرکت سے بھرپور کارآمد زندگی بہت کم لوگوں کو

نصیب ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی ان خدماتِ جلیلہ کو شرفِ قبولیت سے نواز کر ہم طالبانِ علومِ نبوت کو بھی اس سے آراستہ وپیراستہ فرمائے، آمین‘‘۔

بیوہ فنڈ کیسے شروع ہوا؟

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس روئے زمین پر مسلمانوں کی حالتِ زار، اوران کی مصیبتوں میں ان کے کام آنے والے بہت سے افراد پیدا کیے، ان ہی منتخب کردہ بندوں کی فہرست میں قاری مبین صاحبؒ اور قاری حسین صاحبؒ ماکھنگا بھی ہیں، مسلمان ماؤں، بہنوں کی۔ جو اپنے شوہروں سے محروم تنگ دستی میں زندگی بسر کررہی تھیں، جن پر فاقوں کی نوبت آجایا کرتی تھیں۔ مالی فراہمی کے لیے ان دونوں بھائیوں نے قربانیوں اور خدمات کے ایسے نقوش ثبت کیے جو ہم جیسوں کے لیے ایک درسِ عبرت ہے، ان دونوں بھائیوں کا تعارف مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کی زبانی سنئے کہ انہوں نے کس طرح اس بیوہ فنڈ کو شروع کیا اور اسے کیسے فروغ دیا۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں: ’’اول الذکر قاری مبین صاحب بڑے عامل تھے، ہفتہ میں دو دن نوساری عملیات کے سلسلے میں جاتے تھے، ان کے پاس عوام کا کافی ہجوم ہوتا، آپ لوگوں کو تعویذ وغیرہ دیا کرتے، اس دوران اگر آپ کے پاس ازراہِ علاج کوئی مالدار آدمی آتا تو آپ اس کو کہتے کہ دیکھو، ہم نے اس طرح مسلمان ماؤں بہنوں کے لیے مالی فراہمی کا سلسلہ شروع کیا ہے، اگر آپ ہماری

امداد فرمائیں گے تو بڑا نفع ہوگا۔ اس طرح تشکیل کرتے، اور میرے پاس حاصل شدہ رقم بھیجتے، جب ان کا انتقال ہوگیا، تو میں نے قاری حسین صاحب سے بات کی کہ: دیکھو ماشاء اللہ! تم بھی عامل ہو، تم اپنے بھائی کی طرح اس سلسلے کو آگے بڑھاؤ، تو انہوں نے میری بات قبول کر لی۔

واقعی یہ بڑے عجیب وغریب آدمی تھے، استاذِ محترم کے پاس حفظ کیا تھا، اور ہم سے بہت پہلے حافظ ہوئے تھے، استاذِ محترم سے بہت زیادہ تعلق تھا، آپؒ کے بہت سارے اشعار ان کو یاد تھے، ان کی قربانیاں بھی بہت زیادہ ہیں، وہ اپنے بزرگوں کے مشورے سے اٹگاؤں میں ۳۵ / سال تک خدمت کرتے رہے، باوجود اس کے کہ اس گاؤں میں بدعتیوں کا بہت غلبہ تھا؛ لیکن وہ تمام تر دشواریوں سے مقابلہ آرا ہوکر وہاں محنت کرتے رہے، حتیٰ کہ انہوں نے وہاں سے بدعت کو ختم کر دیا۔ ماضی قریب میں ان کا بھی انتقال ہوگیا، اور انتقال بھی عجیب کیفیت کے ساتھ ہوا، وہ اپنی اہلیہ محترمہ اور دیگر حضرات کے ساتھ عمرہ کر کے آئے، ایک دن میری ملاقات کے لیے کفلیتہ تشریف لائے، میں عشا کی سنتوں میں مشغول تھا، وہ بھی حجرے میں میرے پیچھے سنتیں پڑھتے رہے، جب میں نماز سے فارغ ہوا تو بڑی خوشی کے ساتھ کہنے لگے: مفتی صاحب! میں آپ کے لیے مکۃ المکرمہ سے کھجور اور زم زم لے کر آیا ہوں، پھر کچھ دیر گفتگو ہوئی، اور وہ چلے گئے۔ دوسرے دن یہ خبر آئی کہ قاری حسین صاحب کا انتقال ہوگیا۔

واقعی یہ حضرات بڑی خدمات کرکے دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے، اب اس سلسلے میں کوشاں دونوں بھائیوں کا انتقال ہوگیا، تو میں نے ایک اور صاحب سے کہا: میری خواہش ہے کہ اب یہ ذمہ داری تم سنبھالو؛ لیکن اس کا چندہ مت کرنا، تو انہوں نے کہا: ٹھیک ہے، میں اپنے دوست واحباب میں اس کا تذکرہ کروں گا، اور ان شاء اللہ اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں پوری کوشش کروں گا۔ الحمدللہ! یہ سلسلہ آج تک برابر جاری وساری ہے، وہ صاحب ہر سال شعبان کے مہینے میں میرے پاس خطیر رقم ارسال کردیتے ہیں، جب تک استاذِ محترم کی طبیعت بحال رہی آپ نے بڑی قربانیوں کے ساتھ اس کارِ خیر کو انجام دیا (جیسا کہ پیچھے گذر چکا)؛ لیکن جب آپ کی طبیعت میں کمزوری آگئی تو آپ نے عذر کردیا، پھر بہت دشواریاں بھی پیش آئیں، چوں کہ استاذِ محترم سارے کام خود ہی کرلیا کرتے تھے، اب ایک نوجوان کو تیار کرلیا ہے، الحمدللہ! سارے کام وہی کرلیتا ہے''۔

تعمیرِ مساجد کی فکر

آپ کے سلسلۂ خدمات کی ایک کڑی مساجد کی تعمیر بھی ہے، آپ جہاں کہیں قدم رنجہ ہوتے پہلے مسجد تلاش کرتے، اگر ہوتی تو اللہ کا شکر ادا فرماتے، اور اگر نہ ہوتی تو مسجد تعمیر کرنے کی فکر فرماتے۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: سنجان گاؤں میں مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی، عید کے دوسرے دن میرا آپ کے ساتھ وہاں

جانا طے پایا، آپ نے پوری تفصیل مجھ کو بتلادی کہ مفتی صاحب! آپ بارڈولی سے مرولی تشریف لے آنا اور میں ڈابھیل سے وہاں آجاؤں گا اور ہم فلاں ٹرین سے روانہ ہوجائیں گے ان شاء اللہ۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں: پھر میں نے کسی اور سے یہ پیغام پہنچادیا کہ حضرت میرے لیے نوساری کی بس آسان ہوتی ہے میں اس سے آجاؤں گا۔ جیسے ہی آپ کو اس بات کا علم ہوا، آپ فوراً بارڈولی میرے گھر تشریف لے آئے، میں تو رشتہ داروں کو ملنے میں مشغول تھا، مجھے اطلاع ہوئی کہ مولانا گھر تشریف لائے ہوئے ہیں، میں گھبرا گیا، دریافت کیا: حضرت! کیا ہوا؟ کہنے لگے: پورا نظام درہم برہم ہے، تم میرے ساتھ چلو۔ مفتی صاحب کہتے ہیں: یہ معمولی بات تھی، لیکن اس کا فکر آپ کو اس قدر تھا جو آپ کو بے چین کیے ہوئے تھا۔

آپ ''معین المدرسین'' کے رکن

جب جامعہ کے مردم ساز اور جوہر شناس مہتمم حضرت مولانا محمد سعید صاحب بزرگ سملکیؒ نے اردگرد کے حالات کو دیکھا تو علمائے کرام معاشی اعتبار سے بڑی پستی کی طرف جاتے دکھائی دیے، آپ سے ان کا یہ حال دیکھا نہ گیا کہ ایک عالمِ دین ذریعۂ معاش کے لیے اس طرح مارا مارا پھرے، اور انتظام و انصرام کی کوئی شکل نہ ہو، اس درد کے درماں کے لیے آپ نے ایک مستقل تنظیم ''معین المدرسین'' کے نام سے بنائی، جس میں حضرت الاستاذ مولانا رشید احمد کیات صاحبؒ کی بڑی

خدمات رہی ہیں، آپ اس تنظیم کے تأسیسی اراکین میں سے ایک تھے۔

اس سلسلے میں مشفقی و مربی مہتمِ جامعہ حضرت مولانا احمد بزرگ صاحب دامت برکاتہم نے راقم کو بتایا کہ: ''علما کی معاشی تنگی کے پیشِ نظر ایک کمیٹی بنائی گئی، جس میں والدِ محترم مہتمِ جامعہ ڈابھیل حضرت مولانا محمد سعید بزرگؒ (۲) حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم (شیخ الحدیث جامعہ ہذا) (۳) حضرت مولانا اسماعیل صاحب چاسوی دامت برکاتہم (۴) اور حضرت مولانا رشید احمد کیات صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسی شخصیات سرگرمِ عمل رہیں، مجھے بھی ان حضرات کے ساتھ خدمت کرنے کا موقع ملا، لیکن انتظام وانصرام میں مولانا ہم تمام پر فوقیت لے گئے۔ آپ ہی تمام مدرسین کے پاس ان کے گھروں تک رقومات ارسال کرتے، جگہ جگہ تحقیق کرتے کہ کون مدرس مستحق ہے اور کون نہیں؟ اور اس کے علاوہ اور بھی دوسرے تنظیمی کام بڑی دلچسپی سے انجام دیتے''۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''آپ ''معین المدرسین'' کے رکن تھے اور اس کی ساری خدمات آپ بلا معاوضہ انجام دیتے، آپ کو اس کا کوئی معاوضہ جامعہ کی طرف سے نہیں ملتا تھا، پھر بھی تادمِ حیات ایک مخلص کی طرح خدمات انجام دیتے رہے''۔

آخری لمحات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے استاذِ محترم کو صحت وتندرستی کا وافر حصہ عطا فرما رکھا

تھا، آپ تقریباً ۸۰ ؍سال تک قوی وتوانا اور چست ومتحرک طبیعت کے ساتھ جیتے رہے، اس دوران کبھی آپؒ کو دوائیاں کھانے کی بھی نوبت نہیں آئی، لیکن پھر دھیرے دھیرے بیماریوں کے سبب جسمانی اعتبار سے تکالیف آنی شروع ہوئیں، ۸۰ ؍سال کے بعد قوت میں اضمحلال آ گیا، اور صحت وتندرستی گرتی چلی گئی۔

اولاً آپؒ پریشر کی بیماری میں مبتلا ہوئے، اس کے علاج کی تدبیریں شروع کیں تو دوائیوں کی وجہ سے ری ایکشن ہوگیا، چونکہ دوائی استعمال کرنے کی عادت نہیں تھی، حتیٰ کہ اس کا اثر آنکھوں تک پہنچ گیا، جس کی وجہ سے آنکھوں کا آپریشن کرنا پڑا، ابھی کچھ دن گذرے تھے کہ ایک نئی بیماری سامنے آ گئی، جسے ہم شوگر یا ذیابطیس کے نام سے جانتے ہیں، یہ سلسلہ دن بدن دراز ہوتا گیا، حتیٰ کہ آخری عمر میں بیک وقت آپ کو کئی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا اور ہسپتال میں بھی رہنا پڑا؛ لیکن صحت کو بحال نہ ہونا تھا نہ ہوئی۔

علم کے پیچھے پوری زندگی لگانے کا عزم

ایک روز حضرت استاذ محترم کے گھر عیادت کی غرض سے حاضرِ خدمت ہوا، خیر خیریت کے بعد کہنے لگے: ’’شہزاد! کل ہی نوساری سے چیک کروا کر آیا ہوں، آج طبیعت میں سکون ہے، چاہتا بھی ہوں کہ مدرسہ آؤں؛ لیکن گھر والے مانتے نہیں، گھر پڑے پڑے طلبا کی جدائی پریشان کرتی ہے، طلبا کی بہت یاد آتی ہے، یہ پہلا مرحلہ ہے کہ مدرسہ سے اتنا قریب ہونے کے باوجود میں پڑھانے

کے لیے نہیں جاسکتا۔ کیا کرے دل میں تو یہی ارادہ ہے کہ تعلیم و تعلّم کے ساتھ ہی دنیا سے جائے، خیر! اب دیکھتے ہیں، مقدر کب تک ساتھ رہتا ہے‘‘۔

اس سے معلوم ہوا کہ زندگی کی آخری تمنا آپ کی یہی تھی کہ دین کی خدمت کرتے کرتے اور تدریس سے وابستہ رہتے ہوئے پیغامِ اجل آئے، بے شک یہ جذبہ کسی مخلص خادمِ دین کا ہی ہوسکتا ہے۔ امید ہے کہ اللہ کے یہاں استاذِ محترم کا شمار ایسے ہی نیک طینت بندوں میں ہوا ہوگا جو دین کی خدمت کرتے کرتے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

بیمار پرسی کرنے والوں کا ہجوم

جب آپ کی علالت کی اطلاع آپ کے متعلقین کو ہوئی تو گروہ در گروہ عیادت کی غرض سے حاضری دیتے رہے، نیز ہند و بیرونِ ہند سے بہ کثرت فون آئے اور بار بار مرض اور حالات پوچھے جاتے رہے، آپ ہر ایک کو تسلی بخش جواب دیتے کہ: فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میری طبیعت ٹھیک ہے۔

ایک دن جامعہ میں بعد الفجر مسجد کے منبر سے اعلان ہوا کہ ہمارے جامعہ کے استاذ مولانا رشید احمد کیات صاحب کی طبیعت ناساز ہے، تمام طلبہ آپ کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔ راقم نے جب یہ اعلان سنا تو طبیعت میں غم کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، اسی کیفیت کے ساتھ بعد العصر اپنے رفیقِ درس کے ہمراہ دولت کدہ پر حاضری دی، اور زیارت سے مشرف ہوکر آنکھیں ٹھنڈی کیں،

طبیعت کی قدرے بحالی دیکھ کر خوشی ہوئی، تھوڑی دیر گفتگو کرنے کا موقع ملا، دورانِ گفتگو آپ کہنے لگے: ''اتنی کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، ان شاء اللہ جلد شفایابی ہوجائے گی''۔ پھر کہنے لگے: گذشتہ دنوں نوساری یشفین اسپتال میں زیرِ علاج تھا، بہت سارے اساتذہ عیادت کے لیے تشریف لائے تھے، مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم بھی تشریف لائے تھے، صحت یابی کی دعا کی، ہمارے مہتمم صاحب بھی عیادت کے لیے تشریف لائے تھے، اور بیرون سے فرزندوں کے بھی فون بار بار آرہے ہیں، میں ان سے یہی کہہ رہا ہوں: ''زیادہ فون نہ کریں، آپ اپنی مصروفیات میں لگے رہیں۔ ان شاء اللہ عنقریب میں شفا پاجاؤں گا، خیر! آپ لوگ بھی دعا کرتے رہیں، خدا حافظ! جلدی مدرسہ جاؤ، اذان کا وقت ہورہا ہے''۔ یہ راقم کی استاذِ محترم سے آخری گفتگو تھی۔

مرض الوفات میں دیا جانے والا ایک جواب

طلبہ سالانہ امتحان سے فارغ ہوکر خوشی خوشی اپنے گھر چلے گئے، گھر جانے سے پہلے راقم نے استاذ کی عیادت کا ارادہ کیا، لیکن نہ معلوم کونسا ایسا کام پیش آیا جس کی وجہ سے اس کی طرف دوبارہ ذہن نہ جاسکا، غرض میں بھی گھر چلا گیا، ان ہی ایام میں آپ کی طبیعت بہت بگڑ گئی، آپ کو نوساری ہسپتال لے جایا گیا، علاج ومعالجہ کے دوران کسی نرس نے کہا: مولانا! آپ کی طبیعت ٹھیک ہوجائے، تو آپ کونسا جوس نوش فرمائیں گے، فرمایا: ''اب سب کچھ جنت میں جا کر پیئیں گے،

آپ مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیں"۔

وفات حسرت آیات

شوال ۱۴۳۵ھ کی سالانہ تعطیل میں استاذ کی سخت علالت کی اطلاع ملی، اس روز بسیار کوشش کے باوجود نیند نہ آئی، پہلی بار اس موقع پر بڑی شدت سے مجھے اس محبت وتعلق کا احساس ہو رہا تھا، جو استاذِ محترم سے تھا، جامعہ میں آنے کے بعد ساتھیوں سے بالآخر یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ ۳؍شوال ۱۴۳۵ھ کو ملک الموت زندگی کے دروازہ پر آخری دستک دے گئے، اِنا للّٰہ وانا الیہ راجعون.

آپ کی شخصیت ان ہمہ گیر اور آفاقی صلاحیتوں سے سرشار تھی، جنہیں قیدِ تحریر میں لانا مشکل ہے، بس مختصر یہ کہ بقول دانش نجیب آبادی

لگا جو زخم زمانے کو کبھی دل سے نہ جائے گا
یہ گہرا زخم قلب کا کبھی بھر نہ پائے گا
ترا دنیا سے اٹھ جانا زمانے کو رلائے گا
ترا طرزِ ادا ساقی !دلوں کو رلائے گا
گذرتی کیا ہے دیوانوں کے دل پر آپ کے ساقی!
ذرا دیکھو تو آنکھیں کھول کر، دیکھا نہ جائے گا
تری رہبری کی آج ملّت کو ضرورت ہے
پریشاں ہیں کہ اب یہ بارِ گراں کون اٹھائے گا

چراغِ روئے زیبا لیے ڈھونڈے گی بہت دنیا
مگر تجھ سا اب کوئی دیدہ ور ملنے نہ پائے گا
حیاتِ پاک تری جہدِ پیہم سے عبارت تھی
تری قربانیوں کو آبِ زر سے لکھا جائے گا
ترا نامِ گرامی ہوگیا تاریخ کا حصہ
ورق تاریخ کا تجھ کو بھلا کیسے بھلائے گا

غسل ونمازِ جنازہ

زندگی بھر آنکھوں کی ٹھنڈک بنے رہنے والے آپ کے محبوب فرزندِ ارجمند حافظ اسماعیل اور دیگر متعلقین نے غسل دیا، اور نمازِ جنازہ بعد الفجر ڈابھیل آدم پیر نامی مقبرہ کے احاطہ میں ادا کی گئی، جنازہ میں سینکڑوں کی تعداد میں لوگ شریک تھے، اساتذۂ جامعہ اور قرب وجوار کے طلبہ بھی شریک رہے، عوام کا مجمع تو بہت تھا، ہر طرف عجیب وغریب سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔

ایک صاحب کا بیان ہے کہ: آپ کے انتقال کے بعد ڈابھیل گاؤں میں بہت بارش ہوئی، لیکن جس وقت جنازہ تیار ہوا اور قبرستان لے جانے کی ضرورت پیش آئی تو فوراً بارش بند ہوگئی، اور آپ کے دفن کرنے تک بالکل بند رہی، پھر جیسے ہی آپ کو دفن کر دیا تو دوبارہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی، ایسا لگتا تھا کہ آپ کی وفات پر آج آسمان بھی آنسو بہا رہا ہے''۔

آپ کے بڑے فرزند حافظ اسماعیل صاحب زید مجدہٗ نے مغموم قلب کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھائی، اور حضرت مفتی عباس صاحب بسم اللہ دامت برکاتہم نے دعائے مغفرت کروائی۔ دعا میں ''ہائے ہائے'' کی کیفیت تھی، ہر شخص نم دیدہ ہوکر اس مردِ خدا کی دعائے مغفرت میں اپنے آنسوؤں کا ذخیرہ جمع کر کے سعادت مندی حاصل کررہا تھا، خدا خدا کر کے دعا مکمل ہوئی اور لوگ مغموم دل کے ساتھ واپس ہوئے۔

آخری وقت ہے آخری سانس ہے		زندگی کی ہے شام آخری آخری
نامہ بر! تو بھی جا اب خدا کے لیے		ان سے کہنا پیام آخری آخری
میری میت کو دولہا بنایا گیا		اور گورِ غریباں میں لایا گیا
منہ سے رسماً کفن ہٹایا گیا		دیکھ لیں خاص و عام آخری آخری
دوستوں نے جو نہلا کے کفن دیا		دو گھڑی بھی نہ دی تھی کہ دفنا دیا
ٹوٹتے ہی یہ دَم کون کرتا ہے غم		کردیا انتظام آخری آخری
جیتے جی تو کسی نے قدر ہی نہ کی		بے وفا زندگی اب شکیلؔ ہوئی
دنیا والو! مبارک یہ دنیا تمہیں		کر چلے ہم سلام آخری آخری

۹ر شوال کو طلبہ مدرسہ آنے کے لیے روانہ ہوئے، بعض تو وہ تھے جنہیں خبر ہی نہ تھی کہ جامعہ ڈابھیل کا آفتاب ومہتاب، اپنی روشنی سے ہمیں محروم کر کے دارِ فانی سے دارِ بقا کی جانب کوچ کر گیا، جب واقف کاروں سے اس بھیانک خبر

کی اطلاع ملی تو طلبہ کے غمزدہ قافلے جامعہ کی طرف افتاں وخیزاں، اپنے محبوب کا تذکرہ کرتے ہوئے اور ان کی خوبیوں کو اپنے سفر کا موضوع بناتے ہوئے حاضر ہوگئے۔ داخلہ کی کارروائی پوری کرلی گئی، جامعہ اور اہلِ جامعہ رنج وغم کی کیفیت میں مبتلا نظر آرہے تھے، اس مرتبہ طلبہ کی حالت دگرگوں تھی، پہلے کا مشاہدہ تھا کہ طلبہ داخلہ سے پہلے اپنی اپنی کارگزاریاں ایک دوسرے کو سناتے تھے؛ لیکن اس مرتبہ یہ دیکھنے میں آرہا تھا کہ کان میں کچھ اس طرح کی آوازیں آرہی تھیں: مولانا کے مزار پر جاکر ایصالِ ثواب کرنا ہے، حاضری دینا ہے، عصر کا وقت مناسب ہے۔ اس وقت کا تو بندہ کو بھی انتظار تھا، خیر! تھکے ہارے طلبہ دوپہر کے قیلولہ کو پورا کرکے درسگاہ میں آگئے، پھر وہاں وہی یادیں، وہی باتیں، وہی تذکرے جس میں عصر کا وقت قریب ہوگیا، بعد العصر طلبہ جماعت در جماعت قبرستان کی جانب رواں دواں ہوئے، قبرستان پہنچ کر کوئی مولانا غلام صاحب نرولی کی قبر کی طرف جارہا ہے، کوئی مولانا سعید صاحب بزرگؒ کے مزار کی طرف جارہا ہے، کوئی کہاں کوئی کہاں، لیکن آپ کے مزار کا سراغ نہیں لگ رہا تھا، سب طلبہ چہ می گوئیاں کرنے لگے کہ مولانا کی قبر کہاں ہے؟

اچانک دیکھا گیا کہ ایک طالب علم تنِ تنہا ایک قبر کے پاس بیٹھے اس قبر والے کی باتیں یاد کرکے رورہا ہے، سب اس کی طرف لپکے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ان ہی کی قبر ہے، جن کی آپ کو تلاش تھی، پھر تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیا سناؤں! اس

سادگی کے پیکر کی سادی قبر دیکھ کر وہی زندگی کی سادگیاں، مہربانیاں اور حوصلہ افزائیاں یاد آ گئیں، ایصالِ ثواب کے الفاظ سے زیادہ تیز آنسوؤں کی دھاریں تھیں، دل رو رہا تھا، آنکھیں کپکپا رہی تھیں، اس مدہوشی کے عالم میں پتہ نہیں کیا ایصالِ ثواب کیا، کیا مانگا کیا بھولا، پھر دعا کیا تھی؟ داغِ قلب کے جذبات، آنکھوں کا درد، جامعہ کے لیے آپ کا نعم البدل، اہلِ خانہ کے لیے صبرِ جمیل، آپ کے لیے مغفرت، جنت الفردوس کا حصول، قبر میں راحت و آرام کی زندگی، مابعد الموت آنے والے تمام مراحل کی آسانی، آپ کی خدماتِ جلیلہ کو قبولیت کے زیور سے آراستہ کرنے کی دربارِ باری میں التجا؛ شاید ہر کسی نے اس طرح کی دعا کی ہوگی۔ مغرب کی اذان کا وقت ہوا جا رہا تھا، دل نہیں چاہتا تھا کہ محبوب کے در کو چھوڑ کر وہاں سے واپس ہوا جائے، لیکن دل کو اس تسلی کے ساتھ راضی کر لیا۔

عشق سے ہوں گے جن کے دل آباد		وہ رشیدِ مرحوم کو کریں گے یاد

اسے ضرور پڑھیے

جامعہ کو تین بڑی شخصیتوں کے انتقال پر ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا، پہلے قاری محمد علی صاحب سارودی جو عرصۂ دراز سے کینسر اور شوگر جیسے موذی مرض سے نبرد آزما رہنے کے بعد شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ بہ مطابق جون ۲۰۱۴ء دوپہر تقریباً تین بج کر پچیس منٹ پر ربِ حقیقی سے جا ملے، دوسرے: مشفقی و مربی مولانا رشید احمد کیات صاحب شوال المکرم ۱۴۳۵ھ بہ مطابق جولائی

۲۰۱۴ءکورب کریم سے جا ملے، تیسرے: مولانا ابراہیم صاحب کاوی جو ۱۵/صفر ۱۴۳۶ھ بمطابق ۹/دسمبر ۲۰۱۴ءکو دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے۔

ان میں سے ہر ایک کی حقیقت استاذِ محترم مفتی معاذ صاحب مدظلّہ کے قلم سے نکلے ہوئے ایک مضمون میں پڑھیے، مفتی صاحب بڑے اچھوتے انداز میں رقم طراز ہیں: ''ان تینوں بزرگوں کی رحلت سے جامعہ کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا، ان میں سے ہر ایک جامعہ کے لیے ''گوہرِ شب چراغ'' کی حیثیت رکھتا تھا، ان کا وجود جامعہ کے لیے سرتاپا رحمت، ان کی زندگی کا ہر لمحہ طلبہ کے لیے مشعلِ راہ اور منارۂ نور تھا، عجیب بات یہ ہے کہ تینوں میں بہت سے اوصاف وکمالات قدرِ مشترک کے طور پر یکساں تھے، ہر ایک نے جامعہ میں پڑھا اور جامعہ ہی میں پڑھایا، ہر ایک کی خدمت کا دائرہ دہائیوں پر مشتمل، اس قدر طویل عرصے تک ایک ہی ادارے سے منسلک رہنے کے باوجود کسی ایک کا دامن بھی تنازعات کے کانٹوں سے نہ الجھ سکا، وقت کی پابندی اور خاموشی کے ساتھ چپکے چپکے مدرسہ کی خدمت کرتے رہنا ان کا طرۂ امتیاز، ان میں رعب و دبدبہ کے ساتھ شفقت و محبت، متانت وسنجیدگی کے ساتھ ظرافت اور خوش مزاجی، عہدہ ومنصب کے ساتھ تواضع وانکساری اور ٹھوس علم کے ساتھ عمل کا جذبۂ بے پناہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ''شباب سے لے کر شیب'' تک اپنے خونِ جگر کے ہر قطرے سے گلستانِ جامعہ کو سیراب کرنے والے ان بزرگوں کا تعلق نظامت سے جُڑا ہوا تھا، قاری محمد

علی صاحب سارودیؒ تو کتب خانے کے ناظم تھے ہی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب کیاتؒ جامعہ کے ماتحت چلنے والے مکاتب کے ناظم ونگراں تھے، اور حضرت مولانا ابراہیم صاحب کاویؒ خانقاہِ محمودیہ کے ناظم تھے، ان حضرات کی کامیاب نظامت کی اس سے بڑھ کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ جب تک ان کی سرحدِ حیات پر سانسوں کے قافلوں کی آمد ورفت رہی، نظامت کا کانٹوں بھرا تاج ان ہی کے سر پر سجایا گیا۔ اگر کوئی دقیق النظر ان کی حیات وخدمات پر باریک بینی کے ساتھ غور کرے تو ایسے بیسیوں مشترکہ اوصاف نکالے جاسکتے ہیں، آہ! وہ تو اپنی حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ جامعہ کے لیے قربان کر کے چل بسے! اب تو صرف ان کی یادیں رہ گئیں، اور اگر اس کو جرات وگستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کی یادوں کے نقوش بھی دھندلے ہوتے جائیں گے۔

یہ ہمارا المیہ ہے کہ شہرۂ آفاق بزرگوں اور عظیم الشان شخصیتوں کی رحلت پر قلم اٹھا کر سینکڑوں نہیں؛ ہزاروں صفحات سیاہ کردیے جاتے ہیں، ان کی قابلِ رشک زندگی کے دسیوں پہلوؤں پر لکھا جاتا ہے اور ضرور لکھا جانا چاہیے؛ لیکن ٹوٹی چٹائی اور پھٹے بستر پر ایک گوشہ میں بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ ناقابلِ فراموش خدمات انجام دینے والی ہستیوں کو ہمیشہ فراموش کردیا جاتا ہے“۔

لوگوں پر وفات کا صدمہ

استاذِ محترم کی وفات صرف وفات ہی نہیں، بلکہ ایسا حادثہ ہے جس سے

مختلف شعبوں کے دھارے بدل گئے، ان کی چشمِ عنایت سے نہ جانے کیسی کیسی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار تھیں، اور نہ جانے خلوص وللّٰہیت کے کیسے کیسے پیکر تیار ہورہے تھے، آپ کی رحلت صرف رحلت ہی نہیں؛ بلکہ وہ المناک حادثہ ہے جس کا تأثر ہر ایک نے لیا۔ اور کیوں نہ لے جس کی وجہ سے علم وعمل کی کائنات کے ذرے چمک رہے تھے اور جس کی گرمی سے جسمِ انسانی حیات پائے ہوئے تھا وہ چلا گیا۔ روشنی گل ہوگئی تھی، تاریکی اور اندھیرا پھیلتا نظر آرہا تھا، علم وکمال کا آفتاب غروب ہوگیا تھا، اور رشد وہدایت کا روشن چراغ بجھ گیا تھا۔

روشنی جو ہم کو دیتا تھا وہ زیرِ خاک ہے
اک ستارہ اور ڈوبا، آسماں غمناک ہے
بلبلِ باغِ فصاحت اب نہ چہکے گا کبھی
غنچے افسردہ ہیں، پیراہن گلوں کا چاک ہے
فی سبیل اللہ جو مرتے ہیں وہ مرتے نہیں
پھر یہ صدقہ کس لیے ہے! کیوں کلیجہ چاک ہے!
گڑ گڑا کر کون مانگے گا دعا میرے لیے؟
گنگ ہے میری زباں، دامن بھی میرا چاک ہے
کیا ہوا جو شیر سے خالی ہے اس کی کچھار
اب بھی کوسوں دور تک جنگل میں اس کی دھاک ہے

آپ کی وفات سے انتظامی امور میں خلا

استاذِ محترم کی وفات سے نہ صرف جامعہ، بلکہ اطراف و اکناف کے مکاتب، اور بیواؤں کو رقوم پہنچانے کے میدان میں بھی ایسا خلا پیدا ہوا ہے، جس کا بہ ظاہر اس دورِ قحط الرجال میں کما حقہ پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ خدائے قدیر ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے؛ لیکن عرصۂ دراز سے یہی دیکھنے میں آرہا ہے کہ میدانِ علم وعمل اور فضل وکمال کا جو یکتائے روزگار بھی چلا جاتا ہے، اس کی جگہ خالی ہی رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے جامعہ کو استاذِ محترم کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

بابِ دوم

اوصاف وکمالات

انسان کی شرافت، پہچان اور قدر و قیمت کا مدار اس کے بلند کردار، اعلیٰ اخلاق اور عمدہ اوصاف و خصائل پر ہے۔ دنیوی مال و دولت، ظاہری زیب و زینت اور عہدے و منصب کی چمک دمک سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے باوجود مفلس اور قلّاش ہے وہ آدمی جو اوصاف کے گراں مایہ جوہر سے محروم ہے، اور روکھا سوکھا کھانے اور جھوٹا موٹا پہننے کے باوجود مالدار ترین ہے وہ آدمی جس کا دامن اخلاق، کمالاتِ باطنی اور خصائلِ حمیدہ سے مالا مال ہو۔

استاذِ محترم بھی گونا گوں صفات اور عبقری صلاحیتوں کے حامل، بے حد ذہین، اور علم و عمل میں ممتاز تھے، بارگاہِ ایزدی سے آہِ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی کا وافر حصہ پائے ہوئے تھے۔ عہد آفریں، تاریخ ساز اور محنتی و جفاکش تھے، دین و ملّت کے خاموش علَمبر دار تھے، اگر شاعر کی زبانی یوں کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ان گنت اوصافِ حمیدہ تھیں تیرے عزائم کی کنیز
خود عزائم ناز کرتے تھے دیکھ کر تیرا حوصلۂ کردار

یہ سب اوصاف آپ کو مبدأ فیاض کی طرف سے عطا کیے گئے تھے۔ آپ کے اوصاف اہلِ علم کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں، اسی مقصد کے پیشِ نظر آپ کے کمالاتِ ظاہری و باطنی اور اوصافِ حمیدہ وستودہ کی کچھ جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں:

حلیہ

آپ نہ بہت زیادہ لمبے تھے اور نہ بہت زیادہ پستہ قد، درمیانہ قد تھا،

صحت مند وتوانا جسم جس پر گندمی رنگ نمایاں تھا، خوبصورت چہرے پر دو آنکھیں جن میں قوتِ بصارت اتنی تھی کہ آخری زمانہ تک عینک کی ضرورت نہ پڑی، چہرہ سنت نبوی سے آراستہ، اور سینہ کشادگی لیے ہوئے تھا، اکثر سفید کرتا پاجامہ زیب تن فرماتے، سر پر سلی ہوئی کشتی نما ٹوپی ہوتی جو سادگی پر دال تھی، سینہ تان کر کبھی متکبروں کی طرح نہیں چلتے تھے، ہمیشہ عاجزی وانکساری کا پیکر نظر آتے۔ سادگی زندگی کا جز تھی، مزاج میں ظرافت تھی، اور باغ وبہار طبیعت کے مالک تھے۔

قوتِ حافظہ

مبدأ فیاض کی جانب سے آپ کو غضب کا حافظہ نصیب ہوا تھا، اردو و فارسی کے سینکڑوں اشعار ہمیشہ نوکِ زبان رہتے، کئی سال پرانی باتیں حوالے کے ساتھ سنانے کا اہتمام فرماتے، اکثر زبانی سبق سنا کرتے؛ لیکن مجال ہے کہ کوئی طالبِ علم گرفت سے بچ کر نکل سکے، کریما و پند نامہ کے بارے میں مشہور تھا کہ آپ کو یہ کتابیں زبانی یاد ہیں۔ دورانِ سبق اگر کسی کتاب کا حوالہ دیتے تو فوراً سبق کے بعد متعلقہ حوالہ نکال کر طلبہ کو دکھلاتے، اس سے آپ کے شاگردوں کا مزاج بھی اسی قسم کا بن جاتا کہ صرف حوالہ دینے پر اکتفا نہ کیا جائے؛ بلکہ محوّلہ کتاب کو کھول کر باقاعدہ دیکھا جائے۔

نیز اکابر کے واقعات بلاکم وکاست نقل فرماتے، آپ کی ذات تاریخِ جامعہ کا ایک خزینہ تھی، موقع موقع سے ماضی کے حالات چھیڑتے، جب بندہ نے

تاریخِ جامعہ کی ورق گردانی کی تو کئی چیزیں جو آپ سے سنی اس میں حرف بہ حرف موجود پائیں۔

قوتِ حافظہ کی حفاظت اور کھانے میں احتیاط

یاد پڑتا ہے کہ جب استاذ محترم ہمیں ''اردو کی دوسری'' (مولفہ: مولانا اسماعیل صاحب میرٹھیؒ) میں سبق نمبر ۱۸ ''ہماری گائے'' پڑھا رہے تھے، جس کے اشعار استاذِ محترم ہمیں اپنے دل کش ودل آویز لہجے میں سناتے تھے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی		جس نے ہماری گائے بنائی
اس مالک کو کیوں نہ پکاریں		جس نے پلائیں دودھ کی دھاریں
خاک کو اس نے سبزہ بنایا		سبزے کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بَن میں		دودھ بنی وہ گائے کے تھن میں
سبحان اللہ ! دودھ ہے کیسا؟		تازہ، گرم، سفید اور میٹھا
دودھ میں بھیگی روٹی میری		اس کے کرم نے بخشی سیری

اس شعر پر پہنچ استاذِ محترم خاموش ہوگئے اور کتاب کے اگلے سبق ''چند نصیحتیں'' کو سامنے رکھ کر اپنے پند ونصائح اور تجربہ سے ہم ناواقف چھوکروں کو آگاہ کیا، اور گذشتہ سبق کے اس پیرگراف کو پڑھوایا ''ہر بات کو دیکھو اور آزماؤ، جو بہتر ہو اسے اختیار کرو'' پھر فرمایا: ادھر اُدھر کی چیزیں مت کھایا کرو، باہر کی چیزیں کھانے سے احتیاط برتو، قوتِ حافظہ مضبوط رہے گی، ورنہ کچھ بھی کھالوگے تو پتہ بھی

نہیں چلے گا اور قوتِ حافظہ پر زد پڑ جائے گی، پھر اس سلسلے میں ایک لطیفہ سنایا۔

ایک لطیفہ

فرمایا: ایک مرتبہ میں نوساری سے ڈابھیل آرہا تھا، مرولی چوراہے پر اترنے کی ضرورت پیش آئی، اسی اثنا میں دیکھا کہ ایک آدمی پسینہ میں شرابور جلیبی تل رہا تھا، ہاتھ بھی پراگندہ تھے، ستم بالائے ستم یہ کہ اس نے اپنی انگلی سے پیشانی کے قطرے جلیبی کی کڑاہی میں چھڑک دیے۔ پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمانے لگے: میں تو کھانے پینے کے بارے میں بہت احتیاط سے کام لیتا ہوں، ایسی غذائیں کھاتا ہوں جس میں شک وشبہ نہ ہو، گائے کا دودھ روزانہ دیسی گھی میں ملا کر پی لیتا ہوں، اوراس کے ساتھ نرم چپاتی وغیرہ کھالیتا ہوں:

دودھ میں بھیگی روٹی میری		اس کے کرم نے بخشی سیری

احکامِ الٰہی کی بجاآوری کا عمدہ نمونہ

دل کیوں نہیں لگتا طاعتوں میں		اس فکر کے پاس بھی مت جانا
دل لگتا کہاں ہے فرض پر		تیرا تو فرض ہے دل لگانا

توحید ورسالت

بنی الاسلام علی خمس: شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله وإقامة الصلوٰة وإيتاء الزكوٰة والحج وصوم رمضان.

ترجمہ: اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر ہے: سب سے اول لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گواہی دینا یعنی اس بات کا اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، اس کے بعد نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا، اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔

(فضائلِ اعمال جلدِ اول، ص: ۵، فضائلِ نماز)

اس حدیث سے جو جو احکام ایک بندۂ خدا پر فرض ہوتے ہیں، جس کی ادائیگی ہر کلمہ گو پر ضروری ہے، استاذِ محترم نے بڑے اخلاص واستقامت کے ساتھ ان احکامِ خمسہ کی ادائیگی کی اور طلبہ کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہے۔ طلبہ کے سامنے حدیثِ مبارک کے پہلے جملے: "شَهادَةِ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کی ایسی عمدہ انداز میں تشریح فرماتے کہ ہر طالبِ علم ربِّ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کو سن کر "سبحان اللہ" کی صدائیں بلند کرنے لگتا، اور آپ کی اس بہترین تشریح سے ایمان ویقین میں تازگی وشادمانی پیدا ہو جایا کرتی تھی، پھر بڑے مزے سے اپنے پُرسوز لہجہ میں یہ اشعار سنایا کرتے تھے:

نورِ حق، شمعِ الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی ہو خدا، اس کو مٹا سکتا ہے کون

فانوس بن کر جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

کبھی ایمان و اسلام کے متعلق آپ سے کوئی سوال کرتا تو آپ اس سوال کا معقول جواب عنایت فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشکل سے مشکل سوال و اعتراض کا آسان اور عام فہم جواب دینے کا ملکہ عطا فرمایا تھا، خصوصاً اللہ تعالیٰ کی معرفت کے متعلق عجیب وغریب جوابات ارشاد فرماتے جو سوال پوچھنے والے طلبہ کے لیے حیرت انگیز اور عبرت خیز ہوتے۔

ایک مرتبہ استاذِ محترم ٹرین سے جا رہے تھے، ایک غیر مسلم نے آپ سے عرض کیا: اگر آپ اجازت دیں تو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: پوچھئے! اس نے کہا: اس وقت آپ کا بھگوان (خدا) کیا کر رہا ہے، آپ بتلا سکتے ہیں؟ آپ کھڑے ہوئے تھے، وہ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، آپ نے امام ابوحنیفہؒ کے مشہور واقعہ سے استیناس کرتے ہوئے فرمایا: ایک منٹ، پھر اچانک کہنے لگے: آپ اپنی جگہ سے کھڑے ہو جائیے، پھر خود بیٹھ گئے، اور کہنے لگے: اس وقت ہمارے بھگوان نے یہ کام کیا کہ کھڑے ہوئے کو بٹھا دیا اور بیٹھے ہوئے کو کھڑا کر دیا، وہ ہر چیز سے واقف کار ہے، کون کب کیا کرتا ہے اور آئندہ کیا کرے گا، اور اب تک کیا کر چکا ہے سب اس کے علم میں ہے، وہ ہر ایک کو دیکھتا ہے، اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔

غرض! اس بہانے سے خدائے برتر کی ایسی تعریف کی اور ایک ناواقف کے سامنے ایسا بدیہی تعارف کروایا کہ وہ متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ایک قابلِ ذکر واقعہ

اسی طرح کا ایک واقعہ استاذِ محترم خوب مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے، فرماتے: میں ٹرین میں سفر کر رہا تھا، ایک غیر مسلم میرے پڑوس میں بیٹھا ہوا تھا، اس نے مجھ سے کچھ پوچھنا چاہا، میں نے اجازت دے دی، اس نے بہت سارے سوالات مجھ سے کیے، الحمد للہ! میں نے کافی وشافی جوابات دیے، جس کی وجہ سے وہ بڑا متأثر ہوا اور اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی محسوس ہونے لگی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اسلام اس کے قلب میں گھر کرنے والا ہے، بات چیت کے دوران جنّت وجہنّم کا تذکرہ بھی ہوا تھا، چناں چہ اس نے فوراً اسی وقت ایک اور سوال کر دیا کہ جنت کو کس طرح حاصل کیا جائے، تو میں نے نغمگی کے ساتھ برجستہ کہا:

اللہ، اللہ، اللہ بول		جنت کا دروازہ کھول

اس پر وہ پھڑک اٹھا اور کہنے لگا: واہ مولانا صاحب! کیا خوب نسخہ عطا فرمایا، سچ ہے: مالک کے ذکر ہی سے کامیابی مل سکتی ہے۔

قارئین! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک غیر مسلم کو اتنے مختصر وقت میں اسلام کا اتنا بہترین تعارف کرا دیا جائے جس کی وجہ سے اسلام اور اہلِ اسلام کی عظمت اس کے قلب میں جاگزیں ہو، اور مسلمانوں سے جنت کا جو وعدہ کیا گیا وہ اس کی جستجو کرنے لگے، یقیناً یہ بزرگوں کی ایمانی قوّت اور روحانی طاقت کا نتیجہ ہے کہ اپنے چند جملوں کے ذریعے لوگوں کو جہنم سے بچا کر جنت کے راستے کی

طرف گامزن کر دیتے ہیں۔ استاذِ محترم کی زبان میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ لوگوں کے دل موہ لیتی تھی، دیکھئے تو سہی! کتنے مختصر الفاظ میں تاریکی میں پڑے ہوئے انسان کو جنت کا راستہ بتلا دیا۔ اگر اس شخص نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے آپ کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے اور اگر نہ قبول کیا ہو تو اللہ اس کو توفیق عطا فرمائے، آمین۔

نماز کی پابندی

نماز کی پابندی، صفِ اولیٰ کا اہتمام اور وقت سے پہلے مسجد پہنچنے کی فکر، آپ کی زندگی کا ایک نمایاں وصف تھا۔ دادی امّاں کا بیان ہے کہ: ''آپ نماز کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے، جیسے ہی عصر کی چھٹی ہوتی آپ مدرسہ سے گھر تشریف لاتے اور نماز کی تیاری کر کے فوراً مسجد چلے جاتے۔ اکثر نماز محلّہ کی مسجد (جامع مسجد) ہی میں ادا کرتے تھے، اور بیماری کے ایام میں بھی بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے، جب تک مسجد جانے کی سکت باقی رہی برابر مسجد جاتے رہے''۔ یہ تو اہلِ خانہ کی گواہی تھی، باہر والوں کی زبانی بھی سنتے جایئے۔

آپ کے پڑوسی حضرت مولانا بشیر صاحب اورنگ آبادی مدظلّہ العالی فرماتے ہیں کہ: ''مولانا نماز کا بڑا اہتمام فرماتے تھے، صفِ اولیٰ میں نماز سے پہلے ہی آکر بیٹھ جایا کرتے تھے، اور ہمیں خوب نماز کی پابندی کی ترغیب دیتے تھے''۔

اس سلسلے میں راقم کے رفیقِ درس کا بیان ہے کہ: ''ایک مرتبہ استاذِ محترم

نے مجھ کو بلایا اور ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلٰوات وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ میں لفظِ ''وسطیٰ''
سے کیا مراد ہے پوچھا، میں نے عرض کیا: معلوم نہیں، آپ نے بتلایا: یہاں عصر کی
نماز مراد ہے، پھر فرمایا: ''دیکھو: عصر کے بعد اعمال اوپر جاتے ہیں، اس لیے عصر
کی نماز کا پابندی سے اہتمام کیا کرو، تاکہ نامۂ اعمال میں وہ درج ہو جایا کرے''۔

نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرو

اطمینان کے ساتھ نماز پڑھنا اور دوسروں کو اس کی تاکید کرنا آپ کا خاص
وصف تھا۔ اگر نماز میں کوئی شخص خشوع وخضوع کا اہتمام نہ کرتا تو بڑی خفگی کا اظہار
فرمایا کرتے تھے، اسی طرح اگر کوئی شخص نماز میں نامناسب حرکتیں کرتا تو بہت خفا
ہوتے، طلبہ کو بھی نصیحت کرتے ہوئے ہمیشہ فرماتے کہ: ''نماز اللہ تبارک وتعالیٰ کی
اہم عبادت ہے، اگر خشوع وخضوع کا اہتمام کروگے تو بدلہ ملے گا، ورنہ حدیث
شریف میں ہے کہ: بندہ نماز پڑھتا ہے؛ لیکن اس کی نماز کالے کپڑے میں لپیٹ
کر اس کے چہرے پر ماردی جائے گی؛ اس لیے نماز میں سکون ووقار سے کھڑے
رہا کرو''۔ پھر تعجب بھرے انداز میں فرماتے: ''عجیب بات ہے کہ ہمارے طلبا بھی
اوروں کی طرح نماز کے دوران لغو کاموں میں مشغول رہتے ہیں''۔ اسی طرح
چست کپڑے پہن کر نماز پڑھنے والوں پر سخت نکیر فرماتے تھے۔ اور ایسے کپڑے
پہن کر رکوع کرنے والوں کو ''بیل'' سے تعبیر فرما کر اسلامی لباس کی اہمیت بتلاتے
کہ: ''اسلامی ملبوسات بہت عمدہ ہیں، ڈھیلے ڈھالے سیدھے سادے، نہ رکوع

کرنے میں کوئی دشواری اور نہ سجدہ کرنے میں کوئی دقّت، اس سادگی میں جوسکون و اطمینان ہے وہ جدید فیشنوں میں نہیں ہے‘‘۔

صدقہ وزکوٰۃ کا اہتمام

عام طور پر جب انسان تنگی کی زندگی بسر کرتا ہے، تو باری تعالیٰ کی یاد و اطاعت کا پورا لحاظ رکھتا ہے، اور بڑی بڑی نیّتیں کرتا ہے، کہ اگر مال مل جائے تو اتنا خرچ کروں گا، لیکن مال کے ملنے پر اس کی محبت ایسی غالب آجاتی ہے کہ سب بھُلا بیٹھتا ہے، اور عیش ومستی میں مگن ہوکر گلچھرّے اڑاتے پھرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی انسانی مزاج کے اس پہلو کو ذکر کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا﴾۔ (سورۂ بنی اسرائیل)

ترجمہ: اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو ٹال جائے، اور بچائے اپنا پہلو، اور جب پہنچے اس کو برائی تو رہ جائے مایوس ہوکر۔ (ترجمہ شیخ الہند، ص:۳۷۶)

اس آیت کی تفسیر میں عمدۃ المفسرین حضرت علاّمہ شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

’’یعنی انسان کا عجیب حال ہے، خدا تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے اپنے فضل سے تو احسان نہیں مانتا، جتنا عیش وآرام ملے اسی قدر منعمِ حقیقی کی طرف سے اس کی غفلت اور اعراض بڑھتا ہے اور فرائضِ بندگی سے پہلو بچا کر کھسکنا چاہتا ہے، پھر جب سخت وقت آتا ہے تو ایک دم آس توڑ کر اور ناامید ہوکر بیٹھ رہتا ہے، گویا دونوں حالتوں میں خدا سے بے تعلق رہا، کبھی غفلت کی بنا پر اور کبھی مایوسی کی بنا پر (نعوذ باللّٰہ من

کلھا الحالین).

اللہ کا شکر ہے کہ استاذِ محترم انسانی فطرت کے اس آزمائشی دور سے بھی سرخ رو ہوکر نکلے، اولاً تو آپ نے خود ذریعۂ معاش کے سلسلہ میں تنِ تنہا مختلف دشواریوں کا سامنا کیا، اُس وقت تقریباً آپ کی تمام اولاد تعلیم کے مراحل میں تھیں؛ لیکن جب بڑے ہوئے تو انہوں نے آپ کا ہاتھ بٹایا اور رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے آپ کی توجہ، دعا اور محنت سے بیرونِ ملک برسرِ ملازمت ہوگئے، آپ کی تنگی، کشادگی میں تبدیل ہوگئی اور آپ صاحبِ حیثیت بن گئے، خوش حالی کے اس دور میں آپ کے فرزند بہ اہتمام صدقہ زکوٰۃ کا پیسہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے اور آپ اس مال کو برابر بیواؤں اور مسکینوں تک پہنچاتے۔

اس کے متعلق عبدالقادر بھائی Postman (ڈاکیہ) مقیم ڈابھیل فرماتے ہیں کہ: ''مولانا بیواؤں کا بہت زیادہ خیال فرمایا کرتے تھے، میرے ہاتھوں لفافہ وغیرہ منگواتے اور پوری ترتیب کے ساتھ بیواؤں کے گھر پیسہ روانہ فرماتے تھے، واقعی مولانا غریبوں کی بہت زیادہ فکر فرماتے تھے''۔

حجِ بیت اللہ کا شرف

جس طرح باری تعالیٰ نے آپ کو دیگر اعمال کی اپنے وطن میں توفیق عطا فرمائی، اسی طرح باری تعالیٰ نے آپ کو اپنے گھر بلا کر حجِ بیت اللہ جیسی عظیم الشان دولت سے بھی دو مرتبہ مشرّف فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ استاذِ محترم کے دل میں بڑی

تمنا تھی کہ میں حج کرلوں، لیکن معاشی حالات اجازت نہ دیتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے بڑے حوصلہ سے کام لیا اور حج کی نیت سے اپنی تنخواہ میں سے رقم جمع کرتے رہے؛ حتیٰ کہ وافر مقدار میں جب رقم جمع ہوگئی، تب آپ نے اللہ کے فضل وکرم سے اس عظیم فریضے کو انجام دیا۔

قاری محفوظ الرحمٰن صاحب ڈابھیلی مدظلہ فرماتے ہیں: ’’استاذِ محترم نے دو حج کیے، ایک ۱۹۹۷ء میں اور دوسرا تقریباً ۲۰۰۳ء میں۔ دونوں حج میں آپ کے ساتھ اہلیہ محترمہ اور آپ کے چھوٹے بھائی مولانا یوسف صاحب کیات مدظلہ اور آپ کے دیگر رشتہ دار شریک رہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کے حج کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، آمین‘‘۔

حرمین شریفین کی کچھ یادیں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ دورانِ سبق استاذِ محترم نے دربارِ خداوندی میں حاضری کی خشیتِ الٰہی سے لبریز ایک خود گذشت طلبۂ عزیز کے گوش گزار کی، آپ نے فرمایا: جس وقت زیارتِ حرمین شریفین کے لیے حاضری کی توفیق میسر آئی، تو میں نے بڑی بڑی تمنائیں گوشۂ دل میں سموکر اپنے سفر کا آغاز کیا، دورانِ سفر بہت سے دلکش وخوش کن مناظر آنکھوں نے دیکھے، جیسے جیسے منزلِ مقصود قریب ہوتی گئی دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی چلی گئیں، اور دیرینہ جذبات انگڑائی لینے لگے، اور جوں ہی حرمِ کعبہ میں پہنچا تو پہلی ہی زیارت میں یہ دعا مانگی: خدایا!

تیرے شہر کی دو گز زمین کا ایک مختصر حصہ دے کر مجھے تیرے شہر کی موت نصیب فرما۔ پھر مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد میں اسی تمنا کے ساتھ بقیہ ایام گزارتا رہا، پھر جب واپسی ہونے لگی تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی کہ: اللہ کے حضور گواہی کے لیے اس شہر کے پتھروں پر نام لکھ دینا چاہیے، پھر آپ نے لوہے کی کیل سے ایک چٹان پر بطورِ یادداشت، اور دربارِ خداوندی میں سفارش کی امید کے ساتھ اپنا نام رقم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس تمنا کو پوری فرما کر آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں، آمین۔

تعلق مع القرآن

استاذِ محترم قرآنِ مجید کے عاشق تھے، کثرت سے قرآنِ مجید کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسباق کے سننے سنانے اور پڑھنے پڑھانے سے فارغ ہونے کے بعد سوائے کچھ گفتگو وضروری کام کے اکثر استاذِ محترم تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ الفاظِ قرآن کی طرح آپ کو معانئ قرآن سے بھی بڑی گہری مناسبت تھی، موضوعات کی مناسبت سے آیتیں نوکِ زبان رہتیں۔ ایک مرتبہ قرآنِ مجید کی آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ (الایۃ) کی ایسی عمدہ انداز میں تفسیر فرمائی کہ تفسیر میں آپ کے درک اور گہرائی کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اگر استاذِ محترم کے پاس کوئی شخص بیماری وغیرہ کے متعلق کچھ دریافت کرتا تو آپ اس کو اکثر معوّذتین اور آیۃ الکرسی وغیرہ پڑھنے کی تاکید کرتے اور پھر یہ آیت تلاوت فرماتے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَاهُوَ شِفَاءٌوَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (سورہ بنی اسرائیل) اور کہتے:
’’قرآن انسانوں کے لیے شفا ہے، اگر ہم اس کو پڑھنے کا اہتمام کریں گے تو ہماری ہر کمزوری و بیماری ختم ہوجائے گی‘‘۔

اسی طرح کئی مرتبہ راقم نے استاذِ محترم کو بہ چشمِ خود دیکھا کہ جب سبق سننے اور پڑھانے سے فارغ ہوجاتے، تو طلبہ کے درمیان گشت لگاتے ہوئے قرآنِ کریم کی تلاوت فرماتے۔ درسگاہ میں آتے ہی سورۂ یاسین، مزمّل و مدثّر کی تلاوت آپ کے معمولاتِ یومیہ کا ایک حصہ تھا۔ تلاوتِ قرآن سے اس عاشقانہ لگاؤ کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی طرح تمام گھر والوں میں بھی تلاوت زندہ تھی، اور جب کبھی آپ کے دولت کدے پر جانا ہوتا تو گھر تلاوت کے نورانی ماحول سے منور ہوتا۔ آپ کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد بھی گھر میں تلاوت کا ماحول زندہ و پائندہ ہے۔ فللّٰہ الحمد

جن دنوں راقم استاذِ محترم کے حالات جمع کرنے میں مصروف تھا ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ آپ کے گھر خاندانی حالات معلوم کرنے کی غرض سے جانا ہوا تو دیکھا کہ دادی امّاں اپنے چھوٹے چھوٹے پوتوں کا قرآن شریف سن رہی ہیں، اس منظر کو دیکھ کر میں نے عرض کیا: کیا یہ معمول استاذِ محترم کا بھی تھا؟ کہنے لگیں؟ ہاں! وہ تو بڑی پابندی سے اس کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

زندگی کے اخیری ایام میں جب آپ زیادہ بیمار ہوگئے اور درسگاہ آنا

موقوف ہوگیا، تب بندہ زیارت وملاقات کے لیے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا، علیک سلیک اور خیر خیریت کے بعد فرمانے لگے: جب سے بیمار ہوا ہوں، گھر پڑے پڑے اکتا جاتا ہوں، ایک قسم کی بے چینی محسوس ہوتی ہے، بس! ایک قرآنِ کریم ہی ہے جسے پڑھ کر دل کو سکون اور طبیعت کو قرار آتا ہے۔

آپ اکثر ننھے منے طلبا کو مخاطب کر کے اپنے دل موہ لینے والے لہجہ میں کہا کرتے تھے:

سمندر کی کشتی پہاڑوں پر چل نہیں سکتی
جس سینے میں قرآن ہو اس پر تلوار چل نہیں سکتی

اتباعِ سنت

آپ کو سنت سے انتہائی محبت تھی، اس کا فطری اثر تھا کہ بدعات اور رسوم ورواج میں از راہِ مصلحت بھی رواداری آپ کو گوارا نہ تھی، نیز اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے، پوشاک ولباس اور عبادات ومعاملات سے لے کر اجتماعی اور انفرادی زندگی تک میں اتباعِ سنت کے پابند تھے۔ اس سلسلہ میں جامعہ کے استاذ قاری شبیر صاحب نرولی مدظلہ رقم طراز ہیں: ''حضرت الاستاذ عشقِ نبوی سے سرشار اور اتباعِ سنت کے عادی تھے، ہر عمل میں اتباعِ سنت کو ملحوظ رکھتے تھے''۔

آپ کے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اثر طلبہ پر

استاذِ محترم میں عشقِ نبوی کا جذبہ اتنا زیادہ پایا جاتا تھا کہ اس کا اثر درسگاہ

کے طلبا بھی محسوس کرتے تھے، جس کا اندازہ ذیل میں مذکور واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے:

۱۴۳۷ھ میں یہ عاجز تعطیلاتِ عید الاضحیٰ کے باعث گھر گیا تھا، ان دنوں ایک موقع سے عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد گیا، بعد نماز امام صاحب نے مجھ کو فضائل کی تعلیم کرنے کا اشارہ کیا، میں نے کتاب لی اور تعلیم شروع کر دی، تعلیم مکمل ہونے کے بعد، امام صاحب سے کچھ ٹوٹے پھوٹے انداز میں عربی مذاکرہ جاری تھا، اسی اثنا میں اچانک میری نگاہ مسجد کے حوض پر پڑی جس پر ایک حسین و جمیل بزرگ تشریف فرما تھے، جن کے چہرے سے خوبصورتی شعاعوں کے مانند پھوٹ رہی تھی، میں نے امام صاحب سے عرض کیا: الرَّجل الَّذِی جَلَس عَلَی حَوضِ الْمَسجد مَن هوَ؟ تو امام صاحب نے کہا: هو ولیّ من اولِیاء. اس کا سننا تھا کہ ان بزرگ سے ملاقات کا اشتیاق بڑھ گیا، بزرگ حوض سے اٹھ کر مسجد کے دروازے پر تشریف لائے، اور میری جانب اشارہ کیا کہ امام صاحب کو بلاؤ، میں نے امام صاحب سے کہا: بزرگ کچھ فرما رہے ہیں۔ امام صاحب ان کی طرف لپکے، میں بھی ان کے ہمراہ ہولیا۔ امام صاحب نے پہلے بزرگ سے گفتگو فرمائی، پھر میرا تعارف کرانے لگے۔ جیسے ہی انہوں نے سنا کہ یہ جامعہ ڈابھیل میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، بزرگ قدرے مسکرائے اور کہنے لگے: مولانا رشید احمد کیات کے کچھ حالات معلوم ہیں؟ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جواب دیا: مولانا پچھلے دنوں بیمار رہ کر انتقال فرما گئے۔ بزرگ نے ''اِنَّا للّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا، اور

کہنے لگے: وہ میرے استاذ تھے، اور بڑے اچھے استاذ تھے، وقت کے بڑے پابند تھے۔ مجھے جو کتاب سمجھ میں نہ آتی، استاذ مجھ کو الگ سے بٹھا کر دوبارہ سمجھاتے۔

پھر فرمایا: جس وقت میں استاذ کے پاس پڑھتا تھا، میں نے ایک خواب دیکھا: سردی کا زمانہ تھا، استاذ وقت سے پہلے درسگاہ تشریف لے آئے، اور درسگاہ کے کواڑ وغیرہ بند کروادیے، میں تاخیر سے جب درسگاہ میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درسگاہ میں تشریف فرما ہیں، میں فوراً سلام کر کے سبق میں شریک ہوگیا۔ پھر میری آنکھ کھل گئی۔ صبح میں نے یہ واقعہ استاذ کو سنایا تو آپ نے اسے اپنے حق میں نیک فالی سمجھ کر خوشی کا اظہار فرمایا اور خاموش رہنے کی تلقین کی۔ اس سے استاذِ محترم کے مقامِ رفیع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ اپنے طلبہ کی اصلاح وتربیت کی طرف بھی توجہ فرماتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد جب کبھی سبق یاد نہ ہوتا تو استاذ مسکراتے ہوئے فرماتے: میاں! تم تو بس خواب دیکھا کرو"۔

دعاؤں کا اہتمام

آپ ہر موقع کی مسنون دعائیں بھی بڑی پابندی سے پڑھتے تھے، اور ہمیں بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ امتحان کے زمانہ میں خصوصیت سے دعائیں پڑھ کر ہمیں سناتے اور فرماتے: ان دعاؤں کا اہتمام کریں، ان شاء اللہ کامیابی ضرور حاصل ہوگی۔ اور اس کے علاوہ امتحان کی تیاری کے دنوں میں اپنے خطوط وغیرہ میں بھی دعائیہ کلمات لکھ کر روانہ فرماتے۔ نیز امتحان کی تاریخ سے طلبا

کو آگاہ کرنے کے لیے ایک رقعہ تیار کرتے جس میں امتحان کی پوری تفصیل مذکور ہوتی، اور ساتھ ساتھ اس طرح کے دعائیہ کلمات بھی ہوتے: دعا گو ہوں کہ خدا تعالیٰ ہر ایک طالبِ علم کو امتحان میں شاندار کامیابی سے نوازیں۔

طلبا دعا لینے کے لیے آپ کی خدمت میں کثرت سے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالبِ علم حاضرِ خدمت ہوا اور کہا: استاذ جی! دعا فرمائیں کہ میرا ذہن خوب تیز ہو جائے، تو آپ نے فرمایا: ٹوپی نکالو، پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دسیوں دعائیں پڑھیں۔ جو بھی طالبِ علم حاضرِ خدمت ہوتا آپ اس کو امتحان میں کامیابی کی شاندار دعائیں دیتے۔ نیز امتحان سے ایک دن پہلے درسگاہ میں حاضر ہو کر تمام طلبہ کے سامنے دعا کی اہمیت بیان فرماتے، پھر کہتے: اب میرے ساتھ ساتھ دعائیں پڑھتے رہو ان شاء اللہ ذہین نشین ہو جائیں گی، پھر اول و آخر تین تین مرتبہ درود شریف پڑھتے، اور دعائیں پڑھواتے، اور کہتے: امتحان سے پہلے بھی اس طرح ایک مرتبہ عمل کر لینا، کامیابی کا ایک اور طریقہ بھی بہت عمدہ ہے کہ اپنے ساتھیوں اور پورے مدرسہ کے طلبا کے لیے دعاؤں کا اہتمام کریں۔

ہر کام کی ابتدا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے

آپ کی عملی اور اخلاقی زندگی میں ایک اہم بات ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کا اہتمام کرنا ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ حضرت الاستاذ نے کسی کام کو شروع کیا ہو اور بسم اللہ بھول گئے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اواخرِ عمر میں

جب استاذِ محترم اپنے دولت کدہ سے مدرسہ تشریف لاتے، تو میں آپ کے انتظار میں ''دارالسنۃ'' کے سامنے کھڑا رہتا، چونکہ سائیکل کو اس کی جگہ رکھنے کی خدمت میرے ذمہ تھی، استاذِ محترم جب سائیکل لے کر قریب پہنچتے، تو ''الحمدللہ'' کہتے، پھر ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پڑھ کر نہ جانے کتنی دعائیں پڑھتے، اتنی دیر میں سائیکل کو پارک کر دیتا، پھر میں استاذِ محترم کے پیچھے ہو لیتا، استاذِ محترم ہلکے ہلکے قدموں سے زینے کے منزلے طے کرتے رہتے، ہر زینے پر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے، حتیٰ کہ درسگاہ میں داخل ہونے اور مسند پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے بھی بسم اللہ کا اہتمام فرماتے۔ یہ عادتِ شریفہ صرف اپنی ذات تک محدود نہ رکھتے؛ بلکہ ''کل امرٍ ذی بال لم یبدأ ببسم اللّٰہ فھو اقطع'' کی روشنی میں طلبا کو بھی ہدایت فرماتے کہ؛ ''بسم اللہ'' کو اپنی زندگی کا جز بنالو، بڑی خیر اپنی زندگی میں محسوس کروگے۔ ہر کام کی سہولت بسم اللہ میں مضمر ہے، اس کی بڑی برکات ہیں، شیطان سے بچاؤ کا بڑا ذریعہ ہے''۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے، اس عاجز کو اپنے ایک قدیم استاذ صاحب کی خدمت میں کتاب ارسال کرنی تھی، میں پوسٹ سے بھیجنے کے طریقۂ کار سے بالکل ناواقف تھا، استاذِ محترم سے اس سلسلہ میں دریافت کیا، کہنے لگے: کونسی کتاب ارسال کرنی ہے؟ میں نے کتاب پیشِ خدمت کی، فرمایا: ٹھیک ہے، بسم اللہ بول کر اس کی کارروائی شروع کر دیتے ہیں، انشاء اللہ! اللہ کے نام کی برکت

سے منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گی۔ میں نے اس موقع سے استاذِ محترم کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا، ہر موقع پر آپ کی زبان پر بسم اللہ کا ورد تھا، کاغذ نکالنے سے لے کر پوسٹ میں بھیجنے تک دسیوں چھوٹے چھوٹے مراحل تھے، ہر ہر موقع پر آپ کی زبان ''بسم اللہ'' کے مبارک ذکر سے تر بتر رہی۔

حدیث شریف حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلٰی الْمُسْلِمِ کی کچھ جھلکیاں

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ خمسٌ: رَدُّ السَّلَامِ، وَعِيَادَةُ الْمَرِيضِ، وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ (بخاری ومسلم) ترجمہ: مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: (۱) سلام کا جواب دینا (۲) مریض کی بیمار پرسی کرنا (۳) جنارے کے ساتھ جانا (۴) اس کی دعوت قبول کرنا (۵) چھینک کا جواب ''یَرحَمُکَ اللّٰہ'' کہہ کر دینا۔

سلام کا جواب دینا

آپ کا ہر شناسا اس بات کی گواہی دے گا کہ آپ ہر چھوٹے بڑے کو سلام کرنے میں پہل کرتے، درسگاہ میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا، آپ کا دائمی معمول رہا، اسی طرح راستہ چلتے ہوئے کسی سے ملاقات ہوتی تو اولاً سلام کرتے پھر دوسری گفتگو فرماتے اور اگر کوئی سلام کرتا تو اہتمام سے اس کا جواب دیتے۔

بیمار پرسی کرنا

مریضوں کی عیادت کا خوب اہتمام فرماتے، جب کسی کے بیمار ہونے کی اطلاع ہوتی تو خوب دعائیں کرتے، طلبہ سے بھی کہتے: فلاں صاحب بیمار ہیں، ان کی عیادت کے لیے جانا ہوا تھا، دعا کی درخواست ہے۔ اگر کسی عذر کی بنا پر جانہ پاتے تو خط ضرور بالضرور ارسال فرماتے، جس میں تسلی کا انوکھا انداز ہوتا، آنے والے صفحات میں ''خطوط نویسی'' کے عنوان میں اس چیز کو دیکھا جا سکتا ہے۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''مولانا کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ آپ عیادت اور تعزیت کے لیے کثرت سے جایا کرتے تھے، مجھے بھی آپ کے ساتھ کئی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔

جنازوں میں شرکت کرنا

جنازوں میں شرکت کرنا آپ کا عام معمول تھا، اواخرِ عمر میں پیرانہ سالی کے باوجود جنازوں میں شرکت کرتے، اور مرحومین کے لیے ایصالِ ثواب کا اہتمام فرماتے۔

اس سلسلہ میں استاذِ محترم مفتی عرفان احمد مالیگانوی مدظلّہ رقم طراز ہیں: ''کسی کے انتقال کر جانے پر نمازِ جنازہ کا اعلان بذاتِ خود مسجد کے مائک سے کرتے تھے، اور اتنی صاف وشستہ گجراتی زبان میں ٹھہر ٹھہر کر اعلان کرتے کہ سننے والوں کو سمجھنے میں بالکل دشواری نہ ہوتی''۔

دعوت قبول کرنا

سنت پر عمل کرتے ہوئے کبھی کسی کی دعوت کو نہ ٹھکراتے، چاہے کیسا ہی میزبان ہو، غریب ہو یا مالدار، ہر ایک کی دعوت قبول فرمالیتے، البتہ حرام وحلال کی تمیز ضرور رکھتے اور آدابِ مہمانی کا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ اس سلسلے میں جامعہ میں دفترِ اہتمام کے خادم حنیف بھائی کہتے ہیں کہ: ’’میں اکثر مولانا کے ساتھ سفر میں گیا ہوں، جب کبھی دورانِ سفر کسی کی دعوت کھانے کا موقع ہوتا، تو مولانا کھانے کی ہر چیز میں سے کچھ نہ کچھ بچا کر رکھتے تھے۔ اور مجھ سے فرمایا کرتے تھے کہ: ’’جب کسی کے یہاں دعوت کھانے جایا کرو، تو پیچھے کچھ کھانا چھوڑ دیا کرو، چونکہ عموماً میزبان پورا کھانا پیش کرتا ہے، اگر ہم نے ختم کرڈالا تو بے چارے وہ کیا کھائیں گے‘‘؟

چھینک کا جواب دینا

حدیث شریف کے آخری جز ’’تشمیت العاطس‘‘ پر بھی عمل کا اہتمام تھا، درسگاہ میں دیکھا گیا کہ جب کسی طالبِ علم کو چھینک آتی اور وہ ’’الحمد للہ‘‘ کہتا تو آپ فوراً ’’یرحمک اللّٰہ‘‘ کہتے، اور اگر طالب علم ’’یھدیکم اللّٰہ‘‘ نہ کہتا تو آپ اس سلسلے میں پوری تفصیل حدیث کی روشنی میں طلبہ کے گوش گزار کرتے، جس کی وجہ سے رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی جذبہ پیدا ہوتا۔

ہدیہ دینے اور قبول کرنے کا اہتمام

ابتدائی زمانہ کو چھوڑ کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو مالی اعتبار سے اچھا خاصا نواز رکھا تھا، مگر آپ اس مال کو جمع کرنے کے بجائے اوروں پر خرچ کرتے، اور بڑی پابندی سے اہلِ تعلق کو ہدیہ بھیجنے کا اہتمام فرماتے، طلبہ کو بھی ہدیہ دیا کرتے تھے۔ خود راقم کا مشاہدہ ہے کہ ایک مرتبہ اپنے صاحبزادے کے ساتھ درسگاہ میں تشریف لائے اور ایک بھروچی طالبِ علم کو بلا کر کچھ رقم بطورِ ہدیہ عنایت فرمائی۔ ایسے واقعات تو کئی مرتبہ ہوئے، نیز روزمرّہ چھوٹی موٹی چیزیں ہدیہ دینے کا بھی معمول تھا، اگر کسی دن نہ دے سکے تو کم از کم عطر کی بوتل طلبہ کے درمیان اور ارد گرد کی درسگاہوں میں گھما دیتے۔ ایک مرتبہ دو عطر کی بوتل ڈیسک میں سے نکال کر بندہ کو تھمائی اور کہا: جاؤ! مولانا اسماعیل صاحب (پانڈور مدظلہ) سے کہو جو پسند ہو لگاؤ، مولانا نے دونوں بوتلوں میں سے تھوڑا تھوڑا عطر لگا کر، شکریہ کے کلمات کہلوائے۔

ہدیہ کا یہ تعلق طرفین سے تھا۔ آپ بھی لوگوں کو ہدیہ سے نوازتے، اور لوگ بھی آپ کی خدمت میں ہدایا پیش کرتے۔ ہدیہ قبول کرنے میں ایک خاص عادتِ شریفہ یہ تھی کہ شکریہ ضرور ادا کرتے، ہند و بیرونِ ہند سے مختلف متعلقین کی جانب سے مفید کتابیں، قیمتی قلم اور بیش بہا عطر وغیرہ ہدیتاً موصول ہوتے تو آپ ہر ایک کو شکریہ کا مضمون ضرور لکھتے۔ درسگاہ میں کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ آپ کے نام لندن و افریقہ سے ہدیہ آیا اور آپ نے تحریری وزبانی شکریہ ادا کیا۔ ایک مرتبہ

ایک قیمتی قلم آیا جو جسامت میں کافی بڑا تھا، اور آپ جسامت والے قلم عموماً پسند فرماتے؛ کیونکہ آپ قلم پر بہت زور دے کر لکھا کرتے تھے، کہنے لگے: میرے منشا کے مطابق ہدیہ بھیجا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہ رقمطراز ہیں کہ:

''ایک مرتبہ استاذِ محترم نے فرمایا: مجھے اگر کوئی شخص قلم ہدیہ میں پیش کرتا ہے تو میں بہت خوش ہو کر اس کے لیے دعا کرتا ہوں اور میں عمدہ قلموں کا شوقین بھی ہوں؛ کیوں کہ عمدہ قلم سے عمدہ انشا پردازی میں سہولت ہوتی ہے''۔

اسی طرح اساتذۂ جامعہ کی جانب سے بھی مختلف اوقات میں آپ کو ہدایا وغیرہ پیش کیے جاتے تھے، تو آپ بھی بطورِ حسنِ سلوک کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور ارسال فرماتے، اور طلبہ سے کہتے: ''ہمیں دونوں کی تعلیم دی گئی ہے، ہدیہ قبول بھی کرو، اور دوسروں کو دو بھی، صرف قبول کرنے پر اکتفامت کیا کرو، ہدیہ دینے کی عادت بناؤ، اس سے آپسی روابط مضبوط ہوتے ہیں، محبت میں اضافہ ہوتا ہے''۔

نیز ہدیہ میں آنے والی ہر چیز پر نوٹ لکھ کر رکھتے، مثلاً آپ کی کئی کتابوں پر لکھا ہوا دیکھا کہ ''یہ کتاب فلاں صاحب کی طرف سے فلاں تاریخ کو ہدیہ میں آئی'' اس سے جذبۂ احسان شناسی تر و تازہ رہتا ہے۔

علمی ذوق

طالبِ علمی کا زمانہ سراپا علمی و عملی تھا، اس کے اثرات مسندِ درس پر فائز

ہونے سے لے کر آخر ایام تک باقی رہے۔ آپ علم کے بہت ہی حریص تھے، اتنی لگن وحرص کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے، معلومات کے سلسلہ میں آپ ہمیشہ چوکنا رہتے؛ چاہے دینی ہو یا دنیوی، تحقیقی مزاج تھا، لغت سے آپ بہ کثرت استفادہ فرماتے، کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ آپ کسی کتاب کا مطالعہ کررہے ہیں اور کوئی لفظ نیا آ گیا، تو فوراً لغت کی طرف اشارہ فرماتے، اور طالبِ علم ہی سے لغت کھلواتے؛ تاکہ طالبِ علم لغت دیکھنے کا طریقہ بھی سیکھ جائے۔ اس تحقیقی ذوق کے ساتھ آپ نے تقریباً سات دہائیاں پوری کیں، علمی ذوق آپ پر اتنا غالب تھا کہ اگر دورانِ مطالعہ کوئی آپ کے پاس آتا، تو مطالعہ سے فارغ ہونے تک التفات نہ کرتے، شاکر نے سچ کہا ہے:

زندگی کچھ اور شئے ہے علم ہے کچھ اور شئے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی لذت بھی
ایک مشکل کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

کتابیں خریدنے کا شوق

آپ کو چونکہ علم سے حد درجہ تعلق ولگاؤ تھا، جس کا نتیجہ تھا کہ آپ زمانۂ طالبِ علمی سے اپنے پاس کتابوں کا ذخیرہ کرتے رہے، حتی کہ سلسلۂ تدریس سے منسلک ہونے کے بعد بھی آپ کا معمول تھا کہ اپنی تنخواہ میں سے کچھ رقم کتابوں

کے لیے نکال لیتے۔ ایک موقع سے راقم اپنے کچھ رفقائے درس کے ہمراہ استاذِ محترم کے حضور بیٹھا ہوا تھا، ایک ساتھی نے اس وقت کسی لفظ کا معنی دریافت کیا، باوجود معلوم ہونے کے آپ نے حسبِ معمول لغت کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: تلاش کرو۔ پھر ملنے پر خوشی کا اظہار کیا، کہنے لگے: یہ کتاب (یعنی فیروز اللغات) میں نے آج سے بہت سال پہلے خریدی تھی، تنخواہ میں سے کچھ کچھ رقم الگ نکال کر رکھتا رہا، پھر جب اتنی رقم جمع ہوگئی کہ جس سے کتاب خرید سکوں تو منگوالی۔ پھر کہنے لگے: ''ہم کھانے وغیرہ میں بہت زیادہ روپیہ صرف کرڈالتے ہیں، حالانکہ اس کا حاصل فُضلہ کے سوا کچھ نہیں، اس لیے ابھی سے کتابوں کے خریدنے کی عادت بناؤ، اپنے خرچ میں سے پیسہ بچا کر کتابیں خریدنی چاہیے''۔

مطالعہ

استاذِ محترم مطالعہ کے بڑے شوقین تھے، درسی کتابوں کے علاوہ مختلف موضوعات کی کتب زیرِ مطالعہ رہتی تھیں، مثلاً فقہ، حدیث وغیرہ اور اس کے علاوہ بہت سی فارسی کتابیں بھی زیرِ مطالعہ رہتیں، اسی مطالعہ کا اثر تھا کہ آپ کا علم بولتا تھا، کسی نے سچ کہا ہے ''علم در سینہ نہ در سفینہ''۔ آپ کا مطالعہ اتنا گہرا اور وسیع تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینے کو مختلف علوم وفنون سے معمور کردیا تھا، چاہے جس فن کا بھی مسئلہ ہو آپ اس کا کچھ نہ کچھ حل ضرور تلاش کرلیتے۔

اس سلسلے میں دادی امّاں کا بیان ہے کہ: ''آپ گھر پر بھی اکثر اوقات

کتب بینی میں بسر کرتے''۔

روحانی وجسمانی طب سے آپ کو بہت زیادہ شغف تھا، اس سے متعلق کتابوں کا ذخیرہ کر رکھا تھا اور وقتاً وفوقتاً اس کا مطالعہ کر کے مریضوں کی رہنمائی فرماتے۔ حضرت قاری شبیر صاحب مدّ ظلّہ رقمطراز ہیں: ''مولانا چونکہ دنیا دیکھے ہوئے تھے، تجربہ کار تھے، ہر قسم کے آدمی سے تعلق تھا، اس لیے بہت ماہر تھے، بیماری کے نسخے اور مسائل کا حل چٹکی میں فرما دیتے، روحانی وجسمانی امراض کی کتابیں گھر پر موجود تھیں، بلکہ مستقل ایک کتب خانہ تھا، جس کے مطالعہ سے آپ بابِ علم میں انتہائی باکمال ثابت ہوئے۔ اللہ مرحوم کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائیں، اور اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ''مِفْتَاح لِلْخَیْرِ'' اور ''مِغْلَاقٌ لِلشَّرِّ'' بنائیں اور ''خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ'' اور ''اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ'' کا مصداق بنائیں، آمین''۔

زبانِ فارسی سے تعلق

یوں تو استاذِ محترم نے علومِ دینیہ کی ہر شاخ سے پھول توڑے، اور پوری زندگی اس سے اپنے گلشنِ علمی کو سجایا اور سنوارا، لیکن اگر آپ کی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ آپ کا اصل میدان، جہاں آپ کا جوہر خوب خوب چمکا، وہ فارسی زبان ہے، فارسی سے آپ کو اچھی خاصی مناسبت تھی، اور کیوں نہ ہو جب کہ تقریباً ۳۵ ر سال درجاتِ فارسی آپ کے ذمہ رہے۔

سبق کی پابندی

استاذِ محترم کا یہ معمول بہت ہی نمایاں تھا کہ آپ مدرسہ کے مقررہ وقت سے پہلے آجاتے، شاید پورے سال میں کبھی غیر حاضر رہے ہو، ہاں ! البتہ اتنی بات ہے کہ: جس دن مکاتب کا امتحان لینے کے لیے جانا ہوتا، اس دن آپؒ صبح کے چار گھنٹوں میں نہیں پہنچ پاتے، لیکن دوپہر کے دو گھنٹوں میں صبح کی تلافی کی پوری کوشش فرماتے، اس کے علاوہ گرمی کی شدت ہو، یا لُو کے تھپیڑے، لمبے دن ہوں یا چھوٹی راتیں، سخت دھوپ ہو یا موسلا دھار بارش، آپؒ اہتمام کے ساتھ درسگاہ میں پہنچ جاتے تھے، اس پابندی کا نتیجہ تھا کہ آپ وقت پر مقرر کردہ نصاب کی تکمیل کر لیتے، بلکہ اتنی پابندی ہوتی کہ گذشتہ سالوں کے نصاب کا اگر امسال کے نصاب کے ساتھ موازنہ کیا جاتا تو بالکل یکساں ہوتا، حتیّٰ کہ تاریخ میں بھی سرِ مُو فرق نہ ہونے پاتا۔ جب تک آپؒ کے گھٹنوں میں درد نہ تھا، برابر سائیکل پر تشریف لاتے رہے، لیکن مرض الوفات سے قبل جب طبیعت نڈھال ہونے لگی، اور کمزوری غالب آنے لگی تو پھر اپنے فرزند ''منّا بھائی'' کے ہمراہ بائک پر تشریف لاتے، لیکن سبق کا ناغہ نہ فرماتے، آپ کی لسانِ مبارک سے اکثر یہ شعر سنا جاتا:

ہمیں دنیا سے کیا مطلب، مدرسہ ہے وطن اپنا
مریں گے ہم کتابوں پر، ورق ہوگا کفن اپنا

طرزِ تدریس

استاذِ محترم کا طرزِ تدریس نہایت ہی نرالا تھا، جب آپ مسندِ درس پر جلوہ گر ہوتے، تو ایسے ایسے لعل و گہر اور جواہر پارے بکھیرتے کہ دل و دماغ روشن اور نظر و فکر چمک اٹھتے، افہام و تفہیم پر آپ کو بڑی قدرت حاصل تھی، سہل ترین اسلوب، مختصر مگر جامع الفاظ اور کم سے کم وقت میں اپنی باتیں طلبہ کے دل و دماغ میں اتار دینا، آپ کے درس کا خاصہ تھا۔

اس سلسلے میں حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ العالی فرماتے ہیں: ''مولانا مرحوم کا طرزِ تدریس نہایت نرالا تھا، سبق پڑھانے کے موقع سے بچوں کے ساتھ ایسے گھل مل جاتے، کہ طلبہ بڑی آسانی سے غامض سے غامض مضمون اخذ کرلیا کرتے تھے، موضح اشارات، اور حسبِ موقع بدلتا ہوا آپ کا اندازِ بیان؛ اس قدر قابلِ دید ہوا کرتا تھا کہ طلبہ محو ہوجاتے تھے، موزوں اشعار بیان کرکے موضوع کی گہرائی و گیرائی کو آسانی سے تبدیل کردینے کا ملکہ آپ میں بھرپور موجود تھا۔ عربی اول کی صرف ونحو کے خشک مسائل پر مبنی کتابوں کا طرزِ تفہیم اتنا دل آویز رہتا تھا کہ موضوع کی تلخی کا طلبہ احساس تک نہ کر پاتے تھے۔ طلبہ کی نفسیات کا خوب خیال فرماتے، جب انہیں احساس ہوتا کہ طلبہ بارِ سبق سے گراں بار ہوئے جارہے ہیں، تو علمی چٹکلے سنا کر ان کی خشک زمین کو سبزہ زار کرتے، پھر نشاط آنے پر تفہیمِ اسباق میں اس نشاط سے خوب کام لیتے اور علم و

حکمت کی ندیاں بہاتے، سیرت کے نازک نازک گوشوں کو اس انداز سے پیش کرتے جس سے طلبا میں تازگی پیدا ہوجاتی، دلوں میں عظمتِ اسلام کے نقوش قائم ہوجاتے، بایں ہمہ جب سبق سننے کا موقع ہوتا تو ان کے تیور بدل جاتے اور طلبہ اپنے سامنے ایک بارعب شخصیت کو سبق سنتے ہوئے پاتے''۔

حضرت مفتی صاحب مدظلہ کے اس آخری جملے کی تصدیق آپ کے جملہ شاگردان کریں گے کہ اس قدر طلبہ کے ساتھ گھل مل کر رہنے کے باوجود سبق سنتے وقت ذاتِ گرامی پر جو رعب طاری ہوتا اس سے اچھے اچھے طلبہ لرز اٹھتے۔آپ کے ایک خاص شاگرد حضرت مولانا قاری یوسف بھولا مدظلہ العالی اس بابت رقم طراز ہیں:

''حضرت الاستاذ کا معمول تھا، اگر کوئی طالب علم غلطی کرتا تو تیور بدل دیتے،جیسا کہ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے''مالابُدَّ منہٗ'' کو''مالابِلہٗ منہٗ'' پڑھا (با کے کسرہ اور لام کے ساتھ) تو حضرت الاستاذ نے فوراً زور سے نہایت درشتی کے ساتھ کہا: گھاس مت کاٹ، گھاس مت کاٹ! یہ جملہ اس قدر زور سے بولتے کہ طالبِ علم ڈر جاتا تھا۔

آپ کے ایک چہیتے شاگرد حضرت مولانا اسماعیل صاحب نوساری زیدمجدہ (استاذ حدیث جامعہ اصلاح البنات سملک) تحریر فرماتے ہیں:''تدریسی کمال کے بارے میں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ: طویل ترین تجربے نے آپ کو کتابوں سے، ان کے مصنفین سے اور طلبہ کی نفسیات سے خوب اچھی طرح واقف کردیا

تھا؛ لہٰذا افہام وتفہیم کا نرالا انداز، دُرشتی ونرمی کا بہترین سنگم، گاہے طلبہ کی کوتاہیوں پر چشم پوشی تو گاہے سخت گیری؛ یہ وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے طلبہ نہ تو بالکل بے فکر رہ سکتے تھے اور نہ ہی بالکل خوف زدہ؛ بلکہ تمام ہی طلبہ کے دل میں استاذ کی محبت اعلیٰ درجے میں موجود تھی۔ کریما، پندنامہ کے اشعار والہانہ انداز میں بہترین لہجہ میں پڑھاتے، اور ساتھ ہی وعظ ونصیحت بھی فرماتے تھے"۔

ایک مرتبہ مجھے بھی بہت زور سے ڈانٹا، میں نے معصومانہ انداز میں کہا: استاذ! مجھے آپ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ تو حضرت الاستاذ کہنے لگے: میں کوئی شیر تھوڑی نہ ہوں کہ کھا جاؤں گا"۔

سبق سننے کا طریقہ

استاذِ محترم مفتی عرفان احمد صاحب مالیگانوی لکھتے ہیں کہ: "حضرت الاستاذ خود بھی انتہائی چست، چاق وچوبند رہتے تھے اور طلبہ کو بھی ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ بیماری، سستی، کاہلی کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً سنیچر کے دن۔ جو طلبہ کے لیے "یوم الکسل" سے اب بھی مشہور ہے۔ آپ صبح کو درسگاہ میں داخل ہوتے تو پہلے ہی سے غصہ میں بھرے ہوتے تھے (جو غالباً مصنوعی ہوتا تھا) تاکہ طلبہ سبق سنانے میں کسی طرح کی کوتاہی کے شکار نہ ہوں، اور سبق سنتے وقت غلطی ہونے پر شیر کی طرح دہاڑتے، گرجتے اور عصا سے بھی کام لیتے تھے؛ لیکن جوں ہی سبق پڑھانے کا وقت ہوتا بالکل نرم دل، مشفق باپ کی

طرح بن جاتے، جھوم جھوم کر عبارت پڑھتے اور سبق سمجھاتے''۔

درسِ گلستاں و بوستاں اور کریما و پند نامہ کی شہرت

ویسے تو باری تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ہر فن میں مہارت عطا فرمائی تھی، لیکن آپ کو جو خصوصی مہارت درسِ کریما و پند نامہ میں حاصل تھی، وہ قابلِ دید ہوا کرتی تھی، اس قابلیت کا شہرہ خواص میں تو تھا ہی عوام میں بھی تھا۔

عاشقِ جامعہ قاری یوسف بھولا صاحب مدظلّہٗ رقم طراز ہیں: ''استاذِ محترم بوستاں ترنّم سے پڑھایا کرتے تھے، طلبہ بھی سنانے کے موقع سے ترنّم سے سنایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک طالبِ علم بوستاں کا سبق ترنّم میں سنا رہا تھا، اسی اثنا میں مولانا ابرار صاحب دھولیویؒ کا گذر وہاں سے ہوا تو وہ کلاس سے باہر کھڑے ہوکر سننے لگے۔ اچانک حضرت الاستاذ کی نگاہ ان پر پڑی، فوراً مولانا ابرار صاحبؒ نے کہا: حضرت! آپ تو ہر وقت ''باغ'' اور ''باغ'' ہی میں رہتے ہو، یعنی گلستاں و بوستاں میں''۔ اس موقع سے استاذِ محترم نے کچھ نصیحتیں بھی فرمائی تھیں جو ان شاء اللہ اساتذۂ جامعہ سے تعلق ومحبت کے عنوان میں ذکر کی جائیں گی۔

اور رہی بات کریما و پند نامہ کی، تو اس کے متعلق کئی واقعات ذہن میں آرہے ہیں، لیکن ہر واقعہ لکھنا نہ ممکن ہے اور نہ مناسب، اس لیے مشتے از خروارے چند واقعات سپردِ قرطاس کیے جاتے ہیں:

استاذِ محترم کا درسِ کریما و پند نامہ مقبولیت کے بامِ عروج پر تھا، اس مقبولیت و شہرت ہی کا ایک مظہر یہ تھا کہ قرب و جوار کے ائمہ خصوصیت سے سبق سننے کے لیے حاضر ہوتے تھے، بلکہ بعض تو اس انتظار میں رہتے تھے کہ کب کریما و پند نامہ کے درس کا آغاز ہو اور شریکِ درس ہوکر استفادہ کریں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ بندہ جمعہ کے روز ۲۴ / گھنٹے کی جماعت میں گیا، مسجد کے امام صاحب سے تعارف ہوا، بات چیت کے دوران جب ان کو پتہ چلا کہ ہم میں سے کچھ طلبہ فارسی اول مولانا رشید احمد کیات صاحب کے پاس پڑھتے ہیں، تو وہ کہنے لگے: کیا کریما و پند نامہ شروع ہوگئی؟ ہم نے کہا: جی! انہوں نے کہا: ان شاء اللہ میں بھی آنے کی کوشش کروں گا، مولانا عجیب انداز سے پڑھاتے ہیں، بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ پھر دیکھا گیا کہ وہ امام صاحب اپنے ایک رفیق کے ساتھ تشریف لائے اور استاذِ محترم کے درسِ پند نامہ میں شریک ہوئے، جس عاشقانہ انداز میں استاذِ محترم نے سبق پڑھایا اسی مجذوبانہ کیفیت کے ساتھ ان حضرات نے درس سنا، درس کے دوران وہ اپنی خاموش نگاہوں اور بے تاب کیفیتوں سے استاذ کو دادِ تحسین بھی دیتے رہے، اور اخیر میں استاذِ محترم سے مصافحہ ودعا کی درخواست کرکے رخصت ہوئے۔

اسی طرح مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ کو بارہا دیکھا کہ آپ استاذ کی خدمت میں تشریف لاتے اور کریما سنانے کی گزارش کرتے۔ استاذِ محترم فوراً اپنے سوز وگداز بھرے لہجے میں سنانا شروع کردیتے۔ شیخ سعدیؒ کے اشعار آپ کے

دل سوز لہجہ کے ساتھ مل کر عجب سماں باندھ دیتے تھے، سننے والے طلبہ پر اس کا ایک خاص اثر ہوتا، جب پڑھ کر فارغ ہوتے تو مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ اپنی شیریں زبان میں یوں کہتے: مولانا! آج تو شیخ سعدی کی یاد تازہ ہوگئی، دل باغ باغ ہوگیا ماشاءاللہ!۔

طلبہ سے موقع موقع پر پڑھوانے کا اہتمام

استاذِ محترم کی ایک عجیب عادت یہ دیکھی کہ آپ موقع موقع سے مہمان کو خوش کرنے اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے ترنّم میں کریما و پندنامہ پڑھواتے ،اور جس شعر میں سوز وگداز کی کیفیت زیادہ محسوس کرتے اس کو بار بار خود بھی سنتے اور واردین کو بھی سناتے ،جس سے واردین ایک اچھا تأثر لے کر واپس ہوتے۔ مہمان حضرات کو سنانے کے دو مقصد ہوا کرتے تھے: ایک تو یہ کہ مدرسہ سے اچھا تأثر لے کر جائیں اور دوسرا یہ کہ ان بزرگوں کی نصیحت دل ودماغ کے بند دریچوں کو کھول کر انہیں عملی زندگی سے ہمکنار کرے۔ اگر کبھی بیرونِ ملک کے مہمان استاذ کے گھر آتے تو آپ خوبصورت لب ولہجہ اور ترنّم کے ساتھ پڑھنے والے طلبہ کو گھر بلاتے اور ان سے پڑھواتے، مہمان حضرات عبارت سن کر جھومتے اور ترجمہ سن کر عبرت حاصل کرتے۔ بہتیرے مہمانوں کی زبانی سنا کہ: آج مولانا کی برکت سے عبرت خیز اور لائقِ عمل باتیں سننے کو ملیں۔

سبق پڑھانے کا نرالا انداز

پہلے طالبِ علم سے ترجمہ کے ساتھ عبارت خوانی کرواتے اور پھر خود اپنے مخصوص انداز میں مشکل سے مشکل سبق کی ایسی دلچسپ تشریح فرماتے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی بہ آسانی سبق سمجھ لیتا۔

جب آپ پڑھا کر فارغ ہوجاتے تو سبق کو مزید پختہ کرنے کے لیے عبارت خواں سے مکرر سہ کرّر پڑھواتے رہتے؛ تاکہ اغلاط بالکل ختم ہوجائیں، اگر ذرہ برابر بھی غلطی ہوتی تو اپنے مخصوص انداز میں شکن آلود پیشانی کے ساتھ کہتے: مزہ بگڑ گیا، پھر سے لے لے۔ اس طرح مکرّر سہ کرر پڑھانے کی وجہ سے اکثر طلبہ کو اسی وقت سبق ازبر ہوجاتا، خصوصاً عبارت خواں طالب علم کو تو آپ کے اس اندازِ تدریس سے خود بہ خود ساری کتابیں پختہ ہوجاتی تھیں۔ سبق مکمل ہوجانے کے بعد اس کا ایسا خلاصہ ونچوڑ بیان فرماتے کہ طلبہ دنگ رہ جاتے، خصوصاً پندنامہ و کریما کی نصائح پر ایسی روشنی ڈالتے کہ دل فوراً اثر قبول کرلیتا، اس دوران آپ کے لب پر گاہے تبسم رقص کناں ہوتا، اور گاہے چشمِ ناز اشکبار نظر آتی۔

زبانِ فارسی میں ایسی سلاست محسوس ہوتی کہ گویا گنگا جمنا بہہ رہی ہو، زبان کی باریکیاں اور فن کی پیچیدہ گتھیاں چٹکی میں سلجھادیتے، تمرین ومشق اور بول چال کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ قواعد کا اجرا کراتے، سبق کا معیار طالبِ علم کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتا، اگر کوئی مضمون ایک مرتبہ سمجھانے پر سمجھ میں نہ آیا ہو تو مکرّر سہ

کررّ سمجھاتے، اس کے باوجود اگر کسی طالبِ علم کو سمجھ میں نہ آتا تو وہی معاملہ کرتے جو امام شافعی اپنے شاگردوں کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ اس طرزِ عمل کو فخرِ گجرات حضرت مولانا عبد اللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم کی زبانی نقل کردوں:

سیدنا امام شافعیؒ کا طرزِ عمل

فرماتے ہیں: استاذ کو چاہیے کہ طالبِ علم کو ہمت دلائے، اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرے، اس کو اپنے قریب بلائے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرے، اسے کہے کہ بیٹا! کیا بات سمجھ میں نہیں آتی اور کیوں نہیں آتی؟ آ بیٹھ جا میرے پاس۔ میں نے سیدنا امام شافعی علیہ الرحمہ کا قصہ کسی کتاب میں پڑھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سیدنا امام شافعی علیہ الرحمہ کے یہاں مجلس ہو رہی تھی، مسئلہ کی تفہیم فرما رہے تھے، بہت سے طلبہ حضرت کے سامنے تھے؛ لیکن ایک بیچارہ کمزور ذہن کا تھا، بار بار ایک مسئلہ کو دُہرا رہے تھے، عبارت تو ایسی لکھی ہے: ”كَرَّرَ عَلَيْهِ الْمَسْئَلَةَ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَمْ يَفْهَمْهُ“ ستر مرتبہ سمجھایا؛ لیکن وہ نہیں سمجھا، تو شرمندہ ہوا کہ امام صاحب اتنا سمجھا رہے ہیں مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے ”فَخَرَجَ مِنَ الْغُرْفَةِ خَجِلًا“ شرمندگی کے مارے وہ کمرے سے نکل گیا، ”فَتَبِعَهُ الشَّافِعِي رحمة الله عليه وَأَجْلَسَهُ فِيْ غُرْفَةِ الْأُخْرٰى وَكَرَّرَ عَلَيْهِ الْمَسْئَلَةَ حَتّٰى فَهِمَهُ“ عجیب بات ہے امام شافعیؒ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور اس کے پیچھے پیچھے گئے

اور اس کو دوسرے کمرے میں بٹھایا اور فرمایا کہ: مایوس ہوکر جانے کی ضرورت نہیں، بیٹھ جاؤ پھر میں سمجھاتا ہوں۔ اس کو کہتے ہیں جگر کو پاش پاش کرنا، طالبِ علم کے لیے پِتّہ مارنا، طالبِ علم کیوں نہیں بنتے، اگر محنت ہوگی ان شاء اللہ بنیں گے تعلیمی، تربیتی اور فکری بیداری فنّی اساتذۂ کرام ہی پیدا کر سکتے ہیں۔

(ایک اہم وفکری خطاب از مفکرِ ملت حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب کاپودروی، ص: ۱۴)

خارجِ درس سمجھانے کا اہتمام

چونکہ آپ کو درس وتدریس کا تجربہ تھا، اس لیے فوراً بھانپ لیتے کہ فلاں طالبِ علم سمجھ نہیں پایا ہے، ویسے بھی باری تعالیٰ نے ہر ایک کی عقل میں وہ صلاحیت ودیعت نہیں کی ہے کہ فوراً سمجھ جائے۔ اس کا احساس استاذِ محترم کو بھی تھا؛ اس لیے مذکورہ بالا طریقۂ کار کے علاوہ کچھ اور طریقے اختیار کرتے مثلاً رفیقِ درس کے پاس تفہیم کے لیے بھیجتے اور پوری نگرانی کرتے، اگر وہاں صحیح سمجھتا تو ٹھیک؛ ورنہ اپنے مخصوص اشارہ سے سلیٹ منگواتے اور از خود وہ سبق جو طالبِ علم کو الجھن میں ڈالے ہوا تھا لکھ کر واپس سمجھاتے، حتیٰ کہ مدرسہ کا مقررہ وقت پورا ہو جاتا، اور اکثر طلبہ مطبخ کا رخ کر لیتے۔ صد آفریں ہو اس مردِ خدا پر جس نے طلبہ کی تعلیمی ترقی کے لیے اوقات وجذبات کی نہ جانے کتنی قربانیاں پیش کیں، طالبِ علم سے کہتے: جاؤ! کھانے سے فارغ ہو کر آ جاؤ؛ ورنہ کھانا ختم ہو جائے گا، اور تم بھوکے رہ جاؤ گے۔ طالبِ علم معذرت پیش کرتا، استاذ فرماتے: جاؤ! کوئی حرج نہیں، میں

انتظار کروں گا۔ طالبِ علم استاذ کے حکم پر بادلِ ناخواستہ کھانے چلا جاتا، جب فارغ ہوکر واپس آتا تو استاذِ محترم کو استقامت وصبر کا مجسم چہرہ لیے ہوئے بالکل اطمینان سے بیٹھا ہوا پاتا، پھر استاذِ محترم اس کے سامنے سبق کی تفہیم کے لیے ہر ممکن سعی فرماتے۔ ترتیب وار سمجھاتے اور پھر ایک رقعہ تیار کرتے، اور اس کو دیتے جس کی دو جھلکیاں ذیل میں دیکھی جاسکتی ہیں:

فعلِ مضارع

فعلِ مضارع کی تعریف: مضارع وہ فعل ہے، جس میں زمانہ موجودہ، اور آئندہ دونوں پائے جاتے ہوں، اس صورت میں اسے ''فعلِ مضارع'' کہتے ہیں۔ مضارع بنانے کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے؛ مگر مضارع کے واحد غائب بنانے کا عام قاعدہ یہ ہے کہ مصدر کے آخر سے ''دن، یا تن'' گرا کر مضارع کی علامت ''دال ساکن'' لگادیں اور دال سے پہلے حرف کو زبر دے دیں، اب دال سے پہلے حرفِ اول کبھی بدستور رہتا ہے اور کبھی گرایا جاتا ہے، کبھی ایک حرف سے بدلتا ہے، کبھی دو حرف سے بدلتا ہے، کبھی ایک حرف زیادہ کرتے ہیں۔ دال سے پہلے ان گیارہ (۱۱) حرفوں میں سے کوئی ایک حرف ضرور ہوگا، جو آسانی کے لیے اس ترکیب میں جمع ہیں: ''شُر فم اَز سَخُن وِے'' یعنی: ش، ر، ف، م، ا، ز، س، خ، ن، و، ے۔ اب ان گیارہ حرفوں کے اعتبار سے مصدر کی کل گیارہ قسمیں کی جاتی ہیں، اور سوائے ان گیارہ حرفوں کے اور کوئی حرف علامتِ مصدر سے پہلے کلامِ

فارسی میں نہیں پایا گیا۔ پس مضارع میں سے ان گیارہ حرفوں میں، کبھی کوئی حرف بدستور رہتا ہے اور کبھی تو اس میں ردّ و بدل ہوتا رہتا ہے۔

واضح ہو کہ مضارع کی یہ تمام صورتیں سماعی ہیں، قیاسی نہیں ہیں جو گیارہ قسموں سے بالکل ظاہر اور آسان ہے۔

فائدہ: جس طرح کبھی ماضی مطلق کے شروع میں ''با'' زائد آتی ہے، جیسے گفت سے بگفت: اس نے کہا۔ برابر اسی طرح مضارع کے شروع میں بھی با زائد آتی ہے اور اس با کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔ جان لو کہ اگر مضارع کے اول حرف پر ضمہ ہو تو با کو مضموم پڑھیں گے اور اگر کسرہ یا فتحہ ہو تو با کو دونوں حالتوں میں مکسور پڑھیں گے، جیسے بُگوید: وہ کہے۔ بِرود: وہ جاوے۔ بِریزد: وہ گرائے۔ اسم پر جو با داخل ہو اس کو ہمیشہ مفتوح پڑھیں گے، جیسے قلم سے بَقلم اور حرف سے بَحرف پڑھیں گے۔

ماضی تمنائی کی مزید وضاحت

نمبر ٦: ماضی تمنائی: جس سے گذرے ہوئے زمانے کے کسی کام کی آرزو معلوم ہوتی ہو، اسے ''ماضی تمنائی'' کہتے ہیں: جیسے: کیا اچھا ہوتا کہ وہ آتا۔!

لیکن ماضی تمنائی کبھی ماضی استمراری کے معنی میں بھی آ جاتی ہے، کیونکہ آرزو کے معنی حرفِ شرط کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر حرفِ شرط کے بعد واقع نہ ہو تو اس صورت میں ماضی استمراری کے معنی پائے جائیں گے!

جیسے: پروُرْدْ سے پروردے، معنی: کیا اچھا ہوتا کہ وہ پالتا۔

ماضی تمنائی کے کل تین صیغے آتے ہیں، واحد غائب، جمع غائب، واحد متکلم۔

اور جن صیغوں کی علامت میں ''ی'' ہے، جیسے: واحد حاضر، جمع حاضر، جمع متکلم۔ یہ تینوں صیغے ماضی تمنائی کے لیے نہیں آتے۔ کیونکہ دو، دو ''یا'' جمع ہو جانے کی وجہ سے پڑھنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس بنا پر بغیر ''یا'' والے صیغے پڑھے جائیں گے: واحد غائب، جمع غائب، واحد متکلم۔

بندہ رشید احمد

۲۷/ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

اس کے علاوہ اور بھی بہت سی اس قسم کی تحریریں موجود ہیں، لیکن یہ مختصر سوانحی خاکہ ان تمام کے نقل کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

خارج میں پڑھانے کے سلسلے میں حضرت مفتی یوسف صاحب ہانس مدظلہ (استاذِ جامعہ ہٰذا) فرماتے ہیں کہ: ''استاذِ محترم ہمیں خارج اوقات میں اپنے گھر لے جا کر کتابیں سمجھاتے تھے، آگے کا سبق پڑھوانا ہوتا تو پہلے خود الگ سے بلا کر سمجھاتے، پھر علی الاعلان آگے کا سبق پڑھواتے، اِس سے طالبِ علم کا احساسِ کمتری ختم ہوتا اور اسے آگے سبق پڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے''۔

اسی طرح حافظ نعیم الرحمن صاحب اورنگ آبادی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''مجھے عربی اول کی کتاب شرحِ مأۃ عامل سمجھ میں نہیں آتی تھی، مولانا مجھے خارج

میں لے کر بیٹھتے تھے اور ترکیب سمجھاتے تھے‘‘۔

تعلیمی اعتبار سے طلبا کی فکر

سینکڑوں طالبانِ علومِ نبوت آپ کے زیر تربیت رہے، ہر ایک کے متعلق آپ کی یہ فکر ہوتی کہ کچھ پڑھ لکھ لیوے، اس لیے موقع موقع سے نصیحت فرماتے، درجۂ علیا کے طلبہ بھی ملنے کے لیے آتے تو خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد فوراً تعلیم کے بارے میں سوالات کرتے، تکرار کراتے ہو؟ کونسی کتاب کی؟ وغیرہ اس طرح کے سوالات کرتے، اگر نفی میں جواب ملتا تو عمدہ پیرائے میں اپنی تُک بندیوں کے ذریعہ متنبہ فرماتے:

لڑکپن کھیل کود میں کھویا
جوانی میں نیند بھر سویا
بڑھاپا دیکھ کر خوب رویا

خود راقم کو اس کا تجربہ رہا، جب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا تو تعلیمی کارگزاری لیتے، امتحان وغیرہ کے نمبرات پوچھتے، کامیابی پر خوشی کا اظہار فرماتے، اور دعاؤں سے نوازتے۔

حضرت مولانا اسماعیل صاحب نوساری زید مجدہ لکھتے ہیں کہ: ’’طلبہ کی ترقی دیکھ کر آپ بہت خوش ہوتے، جب آگے کے درجات میں یہ ناچیز اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوتا، تو بروقت حوصلہ افزائی فرما کر خوشی کا اظہار فرماتے، اور پھر جب

نوساری جانا ہوتا تو والد صاحب اور بڑے بھائی کے سامنے بھی اظہارِ مسرت کرتے۔اور بارہا یہ تاکید فرماتے کہ: اس نے محنت سے پڑھا ہے، اس کو تدریس اور دینی خدمات کے لیے ہی وقف کردینا، تجارت وکاروبار میں مت لگا دینا‘‘۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

افرادسازی

استاذ محترم نہ تو کوئی عظیم محدّث تھے اور نہ معروف مفسّر، نہ ہی شعلہ فشاں مقرّر تھے اور نہ گہر بار مصنّف، لیکن افراد سازی کے ماہر تھے، اس کا اندازہ دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلے آپ کے شاگردوں کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے، آپ کے تلامذہ علمائے حق، مخلص مبلغین، ماہر مصنفین، شیریں بیاں مقررین، اور محقق اصحابِ افتاء کے طور پر زندگی کے مختلف گوشوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں، اپنی زندگیوں کو زہد وتقویٰ، تواضع وانکساری، صدق وصفا جیسے اوصافِ حمیدہ سے آراستہ کر کے استاذِ محترم کے مشن کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں، کسی نے سچ کہا ہے: وہ مدرّس جو باصلاحیت افراد پیدا کرتا ہے اور مطلوبہ رجالِ کار تیار کرتا ہے، وہ بسا اوقات اُن مصنفین اور قلم کاروں سے زیادہ لائقِ تحسین اور لائقِ شکر وثواب ہوا کرتا ہے، جو نفع بخش کتابوں کی شکل میں صدقۂ جاریہ چھوڑ جاتے ہیں‘‘۔ یقیناً جب آپ کے شاگردوں اور تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا جاتا ہے تو ایسا ہی

محسوس ہوتا ہے۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلّہ کتنے پیارے اور مختصر انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں: ''مولاناؒ اردو، عربی، فارسی کے ماہر مدرّس تھے، جامعہ کے اکثر اساتذہ مولانا مرحوم ہی کے شاگرد ہیں، درخت پھول سے پہچانا جاتا ہے، اور استاذ شاگرد سے، طرفین سے خوبیاں اور فضائل حضرت مرحوم میں جمع تھیں یعنی خود بھی باکمال تھے اور آپ کے شاگرد بھی بڑے باکمال بنے''۔

تربیت کا نرالا انداز

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری محبت کی فراوانی

آپ انتہائی نرمی کے ساتھ طلبا کو ان کا مستقبل بار بار یاد دلایا کرتے تھے، نیز طلبا کو اخلاقی پستی کی ردائے ظلمت سے نکالنے کی ہر ممکن سعی فرماتے، اور موقع موقع سے خوب ذہن سازی فرماتے کہ: ''مستقبل میں ہر ایک کے دل کا سرور بن کر دکھاؤ، دردِ سر نہ بنو کہ اپنے بھی دیکھ کر دور بھاگے، اور پرائے بھی، اِس وقت کو غنیمت سمجھ کر خوب اپنے آپ کو سنوار لو''۔ طرزِ تربیت کے اس انوکھے انداز سے ایسا لگتا تھا کہ ایک مشفق و مربّی باپ اپنے حقیقی بیٹوں کی تربیت کر رہا ہے، یقیناً آپؒ کو اپنی حقیقی اولاد سے زیادہ اپنی روحانی اولاد کی دینی و تعلیمی فکر دامن گیر ہوتی تھی، اکثر یہ سادہ؛ مگر پُر معنیٰ اشعر سنایا کرتے:

پڑھوگے لکھو گے تو بنو گے نواب		کھیلو گے کودوگے تو بنوگے خراب

درسگاہ میں طلبہ پر گہری نظر رکھتے، آپ جس کام میں بھی مشغول ہوتے طلبہ کی طرف توجہ ضرور رہتی، ذرا بھی غفلت محسوس کرتے تو فوراً ناراضگی کا اظہار فرما کر پڑھائی کی طرف متوجہ فرماتے۔

ایک حیرت انگیز واقعہ

ایک مرتبہ کا ذکر ہے، استاذِ محترم صبح سویرے درسگاہ میں تشریف لائے، بندہ روزانہ کے معمول کے مطابق سائیکل مخصوص جگہ رکھنے کے لیے چلا گیا، ابھی سائیکل رکھنے بھی نہ پایا تھا کہ زور زور سے طلبہ کے پڑھنے کی آوازیں آنے لگیں، میں سمجھ گیا کہ کچھ نہ کچھ انہونی ہوئی ہے، بالآخر ڈرتے ڈرتے درسگاہ میں داخل ہوا، استاذِ محترم غصہ سے معمور چہرہ لیے ہوئے درسگاہ میں چکّر لگا رہے تھے، میں اپنی جگہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک ایک طالب علم کو دیکھا جو استاذ محترم سے چہرہ چھپائے بہت ہی کھلکھلا کر ہنس رہا تھا، اس کو دیکھ کر مجھے بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی، اِدھر میں ہنسا اور اُدھر استاذ محترم نے دیکھ لیا، اور حسبِ دستور ''زور سے پڑھو، زور سے پڑھو'' کہتے ہوئے میری جانب بڑھے، میرے ہوش وحواس گم ہوگئے، اور میں مارے ڈر کے کانپنے لگا کہ: اب تو میری خیر نہیں، قیامتِ صغریٰ آنی ہے، جب قریب پہنچے تو اس زور سے لکڑی والا ہاتھ اٹھایا کہ میرے تو اوسان خطا کر گئے، لیکن اتفاق؛ لکڑی پیٹھ پر چسپاں ہونے سے پہلے ہی رک گئی، اور اُسی وقت

درسگاہ کی دوسری طرف شور اٹھا، پھر تو غصہ قابو میں نہ رہا، اور استاذِ محترم ایک شریر طالبِ علم کا قصد کرتے ہوئے آگے بڑھے، اس طالبِ علم نے ایک دم تیزی سے راہِ فرار اختیار کر لی، آپ بھی اس کے پیچھے لپکے، اور اس سادگی وتواضع کے پیکر اور پیرانہ سالی لیے ہوئے استاذ کا پیر تپائی سے ٹکرایا، اور آپ دھم سے گر پڑے، گرتے ہی طلبا کا سر چکرا گیا، بعض تو درسگاہ چھوڑ کر چلے گئے، اور بقیہ مارے شرم کے پسینہ میں غرقاب، ندامت سے چہرے سرخ، ایک بزرگ استاذ کی یہ حالت دیکھ کر نم دیدہ ہو گئے۔

اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام طلبہ کو اس کی کڑی سزا دی جاتی، لیکن آپ خاموش دھیمے دھیمے قدموں سے گدے پر جلوہ افروز ہو گئے، کچھ وقت گذرا، اور غصہ فرو ہوا، تو مسکراتے ہوئے فرمانے لگے: بچے ہیں، عقل کے کچے ہیں، جاؤ سب سے کہو، استاذ بلا رہے ہیں۔ طلبا لرزہ براندام، شرمیلے چہروں کے ساتھ استاذِ محترم کے بلانے پر آ گئے، لیکن وہ شریر طالبِ علم جس کی وجہ سے استاذ گر پڑے تھے، اخیر تک نہ آیا، استاذ نے کہا: اس کو تلاش کر کے محبت کے ساتھ لے آؤ، بسیار جستجو کے بعد بھی اس کا سراغ نہ مل سکا، افسوس کہ وہ مدرسہ سے ہی چلا گیا۔ بھری درسگاہ میں استاذ کا گر جانا ایک افسوسناک سانحہ تھا، مدتوں طلبہ اس واقعہ سے رنجیدہ رہے، مگر استاذِ محترم نے اس واقعہ پر کبھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور طعنوں کے تیز خنجر چلائے بغیر برابر شفقت ومحبت اور لطف ومہربانی کے ساتھ علم وہنر کے جام پلاتے رہے۔

جی چاہتا ہے کہ چوم لیں ان کے نقشِ قدم
کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے

اس موقع پر استاذ محترم مفتی معاذ صاحب مدظلہ کے کچھ جملے مستعار لینا مناسب سمجھتا ہوں:

''جس کا ظرف اتنا وسیع ہو اس کے چشمۂ حیواں سے بیک وقت صوفی و کوفی سیراب نہ ہو تو کیا ہو۔ رأفت وشفقت اور محبّت ومودّت کے اس بہتے دریا میں سرکش سے سرکش اور شرارتی سے شرارتی طالب علم بہہ نہ جائے تو اور کیا کرے، لطف ومہربانی کی اس آتشِ سوزاں اور رحم وکرم کی شمعِ فروزاں میں سنگ دل سے سنگ دل پگھل کر موم نہ ہو جائے تو کیا کرے۔

ہائے افسوس! ایسے مشفق ومربّی استاذ کی رحلت قیامت نہ ڈھائے تو کیا ڈھائے۔

اے ربِّ لم یزل ولا یزال! استاذِ محترم کے اوصافِ حمیدہ کے کچھ چھینٹے ہم طالبانِ علومِ نبوت پر بھی برسا دے، آمین''۔

تربیت کے متعلق حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ لکھتے ہیں: ''ہمیشہ اپنے شاگردوں کی تربیت فرماتے، طالبِ علم کو کسی کام کے لیے بھیجتے تو چند بار اس سے وہ جملہ کہلواتے، اس بہانے طالبِ علم طرزِ تکلم اور گفتگو کا سلیقہ سیکھ جاتا''۔ آگے لکھتے ہیں: ''جو کوئی بچہ ان کے پاس پڑھتا تو اچھا خاصا ہوشیار بن جاتا، اس میں

برجستہ جوابات دینے کی صلاحیت پیدا ہوجاتی، یقیناً آپؒ صرف ہمارے استاذ ہی نہ تھے؛ بلکہ بہترین اتالیق اور مربی بھی تھے‘‘۔

اس سلسلے میں حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ہمارا ایک ساتھی تھا، عمر کے اعتبار سے درسگاہ میں سب سے بڑا تھا، بیچارہ ذہنی اعتبار سے کمزور تھا، اس لیے بار بار امتحان میں ناکام ہوجاتا، اب استاذِ محترم کب تک اس کو چلاتے، پھر بڑی عمر کی وجہ سے مارنے سے بھی پرہیز فرماتے، البتہ کبھی کبھار چھوٹی موٹی سزا دے دیتے، آخر وہ سالانہ امتحان میں بہت ساری کتابوں میں ناکام ہوگیا، جس کی وجہ سے آئندہ سال جامعہ میں آنے سے اس کو منع کردیا گیا، استاذِ محترم کو بھی بہت افسوس ہوا۔ بالآخر دوسرے سال اس نے دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ میں درجۂ حفظ میں داخلہ لے لیا، اور محنت کے ساتھ قرآنِ کریم حفظ کرنے لگا۔ ایک سال کے بعد اس نے استاذِ محترم پر خط لکھا کہ حضرت! میں دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ میں آپ کی دعاؤں کی برکت سے حفظ کر رہا ہوں، اور امسال میں نے بارہ پارے حفظ کرلیے۔ پھر دوسرے سال اس کا خط آیا، اس میں لکھا تھا: اب میرے ۲۶/ پارے مکمل ہوچکے ہیں، ان شاء اللہ آئندہ سال میں حفظِ قرآنِ کریم مکمل کرکے، درجۂ عالمیت میں داخلہ لینے والا ہوں اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب آپ کی تربیت وتوجہات اور دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ: استاذِ محترم اس طالبِ علم کا ذکرِ خیر مجھ سے بار بار کرتے اور بہت خوشی کا

اظہار فرماتے، اور کہتے: کتنا کمزور تھا اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو کیسا نواز دیا!

مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہ لکھتے ہیں کہ: ''استاذِ محترم کے یہاں طلبہ کی تربیت کا عجیب انداز تھا، آپ ہمیشہ اس کی فکر کرتے کہ طلبہ میں غرور وکبر کبھی نہ آئے، اس کے لیے ایک تدبیر یہ کر رکھی تھی، ہر طالبِ علم کو لازماً اپنی املا نویسی کی کاپی پر ہر روز املا چیک کرانے کے موقع سے اپنے نام کے ساتھ احقر وعفی عنہ لکھنا ضروری ہوتا، اگر کوئی طالبِ علم نہ لکھتا تو آپ اس پر سخت تنبیہ فرماتے تھے''۔

طلبہ پر شفقت ومحبت

طلبہ سے آپ کا سلوک اتنا شفقت آمیز ہوا کرتا تھا کہ: ہر طالبِ علم یوں سمجھتا کہ آپ سب سے زیادہ اسی سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ: طلبہ کی باہمی شکایتیں کبھی نہ سنتے، بلکہ جو فریاد لے کر جاتا اسی پر خفا ہوجاتے۔ ایک موقع سے ایک طالبِ علم نے اپنے ہم درس ساتھی کو چھیڑا، تو وہ استاذِ محترم کے پاس فریاد لے کر گیا اور کہنے لگا: استاذ جی! فلاں طالبِ علم پریشان کر رہا ہے۔ استاذِ محترم نے نہایت خفگی کے ساتھ فرمایا: تو کیا کر رہا ہے، جاؤ گھاس مت کاٹو، اپنا کام کرو۔ پھر نصیحت آمیز لہجہ میں کہنے لگے: ''شکایت والا مزاج چھوڑ دو، ورنہ کہیں کے نہیں رہوگے، چاپلوسی اور شکایتیں طلبہ کو برباد کر کے رکھ دینے والی چیزیں ہیں؛ اس لیے میرے پاس شکایت مت لایا کرو، گویا تم شکایت کے ذریعہ طالبِ علم اور استاذ کا تعلق توڑنا چاہتے ہو! ایسا مت کیا کرو، میں اسے

بالکل برداشت نہیں کرتا، طالبِ علمی کے زمانہ میں گندی عادتیں سیکھ لیتے ہو اور پھر زندگی بھر لوگوں کو پریشان کرتے ہو، خود ایسے بنو کہ کسی کو حرفِ شکایت کا موقع مت دو اور اگر کسی سے غلطی ہوجائے تو معاف کردو''۔ اگر کبھی درجۂ علیا کا کوئی طالبِ علم آپ کے شاگردوں کی شکایت لے کر آتا تو اس کی ایسی حوصلہ شکنی کرتے کہ پھر وہ دوبارہ ہمت ہی نہ کرپاتا۔

طلبہ پر شفقت کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ سنتے چلئے! استاذ محترم کی عادت تھی کہ تمام طلبہ کو ایک ساتھ مستقل وقفہ دیتے، اور فرماتے، جاؤ جلدی سے ضروریات سے فارغ ہوکر آجاؤ، اب طلبہ نے عادت بنالی کہ: اِدھر استاذ محترم فراغت کے لیے چھوڑتے اور اُدھر بے ہنگم ہجوم دارالسنّہ کے تہہ خانے میں جادھمکتا، اور شرافت کو بالائے طاق رکھ کر مستی، ہنگامہ، اور شوروغل کی فضا قائم کردیتا، ان کی خرمستیوں کو دیکھ کر اوروں کے تیور چڑھ جاتے۔ ایک موقع سے صفائی کرنے والے کارکن، طلبہ کی ایسی حرکتوں پر غصہ میں آپے سے باہر ہوگئے اور فوراً استاذِ محترم کے حضور شکایت کی، استاذِ محترم نے تو ان کو اپنے مخصوص انداز میں سمجھا کر روانہ کردیا؛ لیکن دوسرے موقع سے پھر یہی صورتِ حال پیش آئی، حتیٰ کہ حضرت مہتمم صاحب کی طرف سے تنبیہ کے لیے کہا گیا، تب آپ طلبہ کی حمایت میں کہنے لگے: ''ہمارے ہی طلبہ دکھائی دیتے ہیں، اوروں کا کچھ نہیں''۔ یقینا ہم غلطی کرتے رہیں، لیکن استاذِ محترم کی پدرانہ شفقت بار بار سزا کے شکنجے سے بچاتی رہی اور سچ یہ

ہے کہ بادی النظر میں ”بے جا حمایت“ نظر آنے والے اس قسم کے واقعات طلبہ پر گہرا اثر ڈالتے، اور وہ اس قسم کی حرکتوں سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو جاتے۔

حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب اودگانوی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ”چہرہ سے جو جاہ وجلال ٹپکتا تھا، اس کے برعکس طلبہ پر شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، خصوصاً کند ذہن طلبہ کے ساتھ بہت ہی زیادہ نرمی اور مہربانی سے پیش آتے تھے، جو ان سے اچھی طرح واقف نہ ہوتا، وہ چہرے کے رعب سے ہیبت زدہ رہ جاتا، اور جو حقیقت شناس ہوتا وہ اس بارعب اور پُر ہیبت؛ لیکن مَن موہی شخصیت سے اپنائیت کے مسحور کن احساس میں کھو کر رہ جاتا“۔

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح وشام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام! تو

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ العالی گویا ہیں کہ: ”اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت مرحوم کے ممتاز اوصاف میں سے تھا، چاہے شاگرد ہو، یا خدام، یا ان سے پڑھے ہوئے اساتذہ ہوں سب کے ساتھ اپنائیت کا معاملہ فرماتے“۔

ایک طالبِ علم کا بیان ہے کہ: مولانا مرحوم بہت ہی مشفق تھے، میں جب بھی حاضرِ خدمت ہوتا ہمیشہ میرے سر پر اپنا دستِ مبارک پھیرتے اور دعاؤں سے نوازتے۔

اور یہ چیز صرف اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ اپنے پاس پڑھنے والے

ہر طالبِ علم کو اس کی ترغیب دیتے اور بسا اوقات عملاً کر کے دکھلاتے۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی عباس دامت برکاتہم کے ساتھ پیش آمدہ واقعہ پڑھیے! مفتی صاحب آپ کے ہونہار شاگردوں میں سے ہیں، اور آپ سے انتہائی تعلق و ربط رکھتے تھے، ایک مرتبہ درسگاہ میں کسی غرض سے حاضر ہوئے، استاذِ محترم سے کچھ دیر محوِ گفتگو رہے، جب رخصت کی اجازت چاہی تو استاذ محترم نے کہا: آپ کے دستِ بابرکت سے ہمارے طلبہ مستفید ہو جائے؛ اس لیے سب سے مصافحہ کر لیجیے۔ مفتی صاحب مدظلہ سر جھکا کر مسکرانے لگے، لیکن بات استاذِ محترم کی تھی کیسے ٹالتے، استاذِ محترم نے ہماری جانب اشارہ کر کے کہا کہ مفتی صاحب سے مصافحہ کر لو، جلدی لائن لگاؤ، شور مت کرنا، دیر مت لگانا، مفتی صاحب کو جانا ہے! جب مصافحہ شروع ہوا تو استاذِ محترم ایک طالبِ علم کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے، جب اخیر میں اس کا نمبر آیا تو آپ نے مفتی صاحب سے فرمایا: اس سے بھی مصافحہ کریں اور اس کے سر پر شفقت سے دعا پڑھتے ہوئے ہاتھ بھی پھیریں؛ تاکہ ذہن خوب تیز ہو جائے۔ مفتی صاحب نے ایسا ہی کیا، پھر دعا کی درخواست کرتے ہوئے چلے گئے۔ مفتی صاحب کے جانے کے بعد استاذِ محترم دیر تک آپ کا ذکرِ خیر کرتے رہے۔

حوصلہ افزائی

آپ کی ممتاز اور نمایاں خوبیوں میں سے ایک حوصلہ افزائی بھی ہے، آپ موقع بہ موقع الگ الگ انداز سے طلبہ کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے، حوصلہ

افزائی کرنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جب استاذِ محترم کے پاس کوئی مخصوص مہمان یا جامعہ کے اساتذہ ہی میں سے کوئی آ جاتا تو آپ طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے اسباق پڑھواتے، جب طلبہ سنا کر فارغ ہو جاتے، تو آپ خوب دعاؤں سے نوازتے، اور خوشی خوشی واردین وصادرین سے طلبہ کا تعارف کرواتے، بہت سی مرتبہ مہمان بھی فرطِ مسرت میں طلبا کے لیے دعائیں کرتے اور ساتھ ساتھ کچھ انعام وغیرہ سے بھی نوازتے۔

بندہ خود اس کا عینی شاہد ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے بڑے فرزند حافظ اسماعیل صاحب کیات (مقیم لندن) تشریف لائے تو استاذِ محترم نے ان کے سامنے پوری درسگاہ کی طرف سے ایک طالبِ علم کو ترجمان بنایا اور کریما سنانے کا حکم فرمایا، اس طالبِ علم نے اس جاذبیت اور دلچسپی سے سنایا کہ درسگاہ میں ''ماشاءاللہ'' کی صدائیں گونجنے لگیں۔ جب استاذِ محترم نے اس طالبِ علم کو قریب بلا کر تعریف کرتے ہوئے دعاؤں سے نوازا تو آپ کے فرزند نے تقریباً چار سو روپے اس طالبِ علم کے لیے ہدیتاً استاذِ محترم کے مبارک ہاتھوں میں دیے اور کہا: ابّا جان! آپ ان کو انعام سے نوازیں۔

اسی طرح موقع بہ موقع پڑھوانے کے لیے طلبا کو گھر لے جاتے، گھر کے تمام افراد کو ایک حجرہ میں جمع کرتے، پھر طالبِ علم سے کہتے: سناؤ! طالبِ علم استاذِ محترم کا مخصوص انداز اپنا کر ہر ایک کے دل کو جیت لیتا، وہاں بھی انعام واکرام

سے نوازا جاتا اور ضیافت سے لطف اندوز ہونے کا موقع بھی میسر آتا۔ ایسے سینکڑوں واقعات قارئین کی نذر کیے جاسکتے ہیں؛ لیکن طوالت کے خوف سے اس کو ترک کر کے اب چند اساتذہ کے ذاتی مشاہدات سپردِ قرطاس کرتا ہوں:

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''میں جس وقت دارالافتاء میں زیرِ تعلیم تھا، ایک دن استاذِ محترم آکر مجھے کہنے لگے: تجھ کو میرے ساتھ امتحان لینے کے لیے چلنا ہے، میں نے از راہِ ادب کہا: میں کہاں امتحان لوں گا؟ اتنے سارے اساتذہ موجود ہیں، ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں، مجھے کہنے لگے: نہیں، چلنا ہوگا، ابھی سے سب سیکھ جاؤ۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، جب آپ نے یہ محسوس کیا کہ یہ نہیں آئے گا تو دوسرے دن سیدھے حضرت مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم کے پاس دارالافتاء میں آگئے، اور کہنے لگے: مفتی صاحب! میں عباس کو بارڈولی امتحان لینے کے لیے لے جانا چاہتا ہوں، آپ کی کیا رائے ہے؟ تو مفتی صاحب نے کہا: ضرور لے جائیں، فقط دفتر میں اطلاع کردیں، آپ نے کہا: وہ تو میں نے بات کرلی ہے۔ اس قدر حوصلہ افزائی کر کے آگے بڑھاتے تھے''۔

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''مرحوم میں اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اس درجہ غالب تھی کہ اپنے مقام ومرتبہ کا لحاظ بھی اس موقع سے نہیں کیا کرتے تھے، یہ ان کی ذرّہ نوازی ہی تھی، کہ اپنے پاس

زانوئے تلمذ تہ کیے ہوئے تلامذہ، جب مقامِ استاذیت پر پہنچ جاتے، اور کہیں ان کا خطاب، یا مجلسِ وعظ وتذکیر ہوتی تو بڑی سادگی سے اس میں استفادے کے انداز کے ساتھ بیٹھ جاتے، اور وعظ کے اختتام پر بڑی حوصلہ افزائی فرماتے، وعظ میں جو خوبیاں نظر آتیں اسے فرداً فرداً ذکر فرماتے"۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ رقمطراز ہیں: "جس وقت جامعہ کے مشہور استاذ مولانا رشید احمد سیلوڈی مدظلہ کی والدہ کا انتقال ہوا، تو سیلوڈی تعزیت گاڑی میں بہت سارے اساتذہ ساتھ گئے، چونکہ مولانا رشید احمد صاحب سیلوڈی بڑے مہمان نواز واقع ہوئے ہیں، بغیر کھائے آنے نہ دیا، مغرب بعد ان کے گھر بیٹھے ہوئے تھے کہ عشا سے قبل مولانا مرحوم اٹھ کر مولانا رشید احمد مدظلہ سے درخواست کرنے لگے: قاری شبیر صاحب کو نماز پڑھانے کا موقع دیجیے۔ یہ تھی مولانا کی ہمت افزائی۔

اسی طرح کئی مرتبہ شیخ الحدیث حضرت مولانا اکرام علی صاحب بھاگلپوریؒ کا آس پاس کی بستیوں میں بیان طے ہوتا، اور مولانا مرحوم بھی اکثر ساتھ ہوتے، تو مجھ غریب کو قراءت ونعت کے لیے آگے بڑھاتے، اور تعریفی کلمات سے نوازتے"۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: "اکثر مجھے اپنے ہمراہ لے جاتے، جگہ جگہ میرا بیان کرواتے اور خوب دھیان سے سنتے، اور

دورانِ بیان کسی جملہ کو ذہن میں نوٹ کر لیتے، پھر بیان ختم ہونے کے بعد اس جملہ کو بار بار دہراتے، اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ ایک مرتبہ خیرگام لے گئے، ایک بہت پرانے بزرگ وہاں رہتے تھے، جو ''حافظ کافی'' کے نام سے مشہور تھے، وہاں امامت کرواتے تھے، انہوں نے وہاں میرے پاس بیان کروایا، میں نے قرآنِ کریم کی عظمت وفضیلت پر بیان کیا، آپ بہت خوش ہوئے اور حوصلہ افزائی فرمائی''۔

استاذ محترم مفتی عرفان احمد صاحب مالیگانوی رقم طراز ہیں: راقم کے ساتھ استاذِ محترم کی خصوصی شفقت تھی، پڑھنے کے زمانے سے ہی آس پاس کے گاؤں اور دیہاتوں میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتے، حاضرین کے سامنے قرأت پڑھواتے اور ملنے جلنے والوں سے میرا تعارف کراتے کہ میرا شاگرد ہے، اور چنیں ہے چناں ہے، راقم کے ساتھ خصوصی شفقت وعنایات کے سبب میری حضرت الاستاذ کے دولت کدے پر حاضری بھی بہ کثرت ہوتی رہی۔ ہمیشہ شربت اور دیگر اشیا سے تواضع فرماتے؛ بلکہ میرے مدرس بننے کے بعد بہت سی جگہ مجھے تقریر اور بیان کرنے کے لیے لے گئے، خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

آپ کے ایک شاگرد حضرت مولانا یوسف صاحب بھولا مدظلہ العالی لکھتے ہیں کہ: ''بندہ جس وقت فارسی دوم میں آپ کے پاس زیرِ تعلیم تھا، اس وقت قاری عباس صاحب دھرم پوریؒ نے سورۂ توبہ کا ایک رکوع مجھے یاد کروایا تھا، اس پر استاذِ

محترم کو بہت خوشی ہوئی؛ اس لیے کہ ان کا شاگرد اسٹیج پر پڑھنے والا تھا‘‘۔

حوصلہ افزائی کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ استاذِ محترم انجمنوں کے سالانہ جلسوں میں بہت دھیان اور توجہ سے نوٹ کرتے کہ کون طالبِ علم کس طرح اپنی پوشیدہ صلاحیت کا اظہار کر رہا ہے، جو اچھی طرح آپ کی نگاہ میں رچ بس جاتا، ان کے نام نوٹ کر لیتے، اور کہتے: فلاں دن فلاں وقت گھر پر آ کر اس کو دوبارہ سنانا ہے؛ تاکہ اور پختہ ہو جائے، اور ہر ایک کے سامنے سینہ کھل جائے۔ طلبہ ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے وقتِ مقررہ پر پہنچ جاتے، استاذِ محترم معمول کے مطابق گھر والوں کو جمع کر کے سنواتے اور حوصلہ افزائی کر کے طلبہ کے ہنر وفن کو جلا بخشتے، ہر ایک کو یہ شعر سنا کر حوصلہ وہمت دلاتے:

انجام اس کے ہاتھ میں ہے آغاز کر کے دیکھ
بھیگے ہوئے پروں سے پرواز کر کے دیکھ

اٹھ! باندھ کمر کیا ڈرتا ہے		پھر دیکھ! خدا کیا کرتا ہے

پردہ پوشی

آج کل جسے دیکھئے وہ اوروں کی خامیوں کا سراغ لگائے پھرتا ہے، اور خود اپنے عیوب سے آنکھیں موند لیتا ہے، اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرے اور اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لے تو معاشرہ اپنی عمدگی اور خوبصورتی میں اوجِ ثریا پر پہنچ سکتا ہے۔ اس چیز کا استاذِ محترم کو بہت احساس تھا، آپ کی ہر وقت یہی فکر ہوتی کہ

ہر طالبِ علم اپنے بھائی کی پردہ پوشی کرے، اس کے عیوب اچھالنے کے بجائے اپنی فکر کرے، جب ہر طالبِ علم یہ سوچے گا تو جھگڑے فساد کی بات ہی نہ ہوگی، اس لیے آپ اوروں کی شکایت لے جانے پر اتنا غصہ ہوجاتے جس کو تعبیر کرنا مشکل ہے۔ یقیناً آپ پردہ پوشی کا ایک عظیم سائبان تھے جس کے سایہ میں نہ جانے کتنے طلبہ نے پرورش پائی۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ رقمطراز ہیں کہ: ''ایک مرتبہ ایک مکتب میں امتحان لینے کے لیے جانا ہوا، جب فارغ ہوکر واپس ہورہے تھے تو امتحان کے سلسلہ میں رکشہ میں بات چھڑ گئی، بندہ نے کہا: دل داغ داغ ہوگیا۔ رکشہ میں بستی کے بھی کوئی صاحب بیٹھے ہوئے تھے، تو مولانا نے فوراً فرمایا: تعلیم سے دل باغ باغ ہوگیا، تاکہ وہ غلط پیغام نہ لے۔ پھر فرمایا: ''ہم مدرّس کے بدلنے کے قائل نہیں ہیں، مدرّس میں تبدیلی کے قائل ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری وجہ سے کسی مدرس کو کوئی خدمت سے محروم نہ کردے، کبھی کمی بچے اور والدین کی بھی ہوتی ہے؛ اس لیے صرف مدرّس کے عیب نہ نکالے جائیں''۔ یہ قابلِ توجہ بات ہے، چونکہ بات بات میں مدرّس کو نکال دینا عام ہوتا جارہا ہے، اگر حقیقتاً غلطی ہے اور تحقیق کرے تو کوئی حرج نہیں ہے؛ ورنہ تو تبدیلی سے بچوں کا نقصان ہوتا ہے، ہر مدرس شروع سے ہی پڑھائے گا جس کی وجہ سے ترقی نہ ہوسکے گی، اس لیے مدرس میں تبدیلی لانی چاہیے اِس طرح کہ اس کو تعلیم کی نوعیت سے آگاہ کیا جائے وہ ان

شاء اللہ اصلاح کرلے گا، اور عوام کا بھی ایسا ہی ذہن بنانا چاہیے؛ ورنہ تو بچوں کا بہت نقصان ہوگا''۔

نیز اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہ رقمطراز ہیں کہ: استاذِ محترم کی ایک عادت کو بہت غور سے دیکھا کہ جب کسی طالبِ علم کے والی استاذ کو ملنے کے لیے آتے تو آپ طالبِ علم کی شکایت نہیں کرتے تھے کہ یہ غبی ہے، کمزور ہے محنت نہیں کرتا ہے؛ بلکہ والی کے سامنے اس کی تعریف کرتے تھے اور کتاب کے آسان مقام سے اس کو پڑھواتے تھے، اور اس دوران اس کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے''۔

پردہ پوشی کے سلسلے میں مفتی عرفان احمد مالیگانوی مدظلّہ فرماتے ہیں کہ: حضرت الاستاذ کی ایک بہت بڑی خوبی جو شاید آپ ہی کا حصہ تھی وہ یہ کہ اپنے پاس پڑھنے والے شاگرد کا کوئی سرپرست اگر استاذ سے ملنے کے لیے درسگاہ میں آجاتا تو اس کے سامنے اس طالبِ علم کی بے حد تعریف کرتے تھے، چاہے وہ بالکل غبی ہی کیوں نہ ہو، اور تعریف کرتے وقت اس بات کا خاص لحاظ رکھتے کہ کہیں وہ طالبِ علم سن نہ لے، پھر بھی اگر آپ محسوس کرتے کہ طالبِ علم نے بات کو سن لیا ہے، تو مہمان کو رخصت کرنے کے بعد اس طالب کو مخاطب کرتے اور غراتے ہوئے کہتے: ''اوئے! آئینہ میں اپنی شکل دیکھی ہے؟'' بس سارے طلبہ ہنس پڑتے اور اس طرح عیب بھی چھپا رہتا اور وہ طالبِ علم بھی خود فریبی میں پڑنے سے محفوظ ہوجاتا۔

اندازِ گفتگو

استاذِ محترم کا اندازِ گفتگو بڑا سادہ؛ مگر دلکش ہوا کرتا تھا، رواں بولتے تھے، لب ولہجہ سنجیدہ تھا، نہایت جچی تلی گفتگو فرماتے، اسی وجہ سے جب کبھی طلبہ آپ کو کسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے پاتے، فوراً خاموش ہو کر سننے لگتے، پھر آپ مخصوص انداز میں مجلس کو اس طرح گرماتے کہ سب خوش ہو جاتے، اور بعض مرتبہ سامعین پر اتنا اثر ہوتا کہ ہر شخص آب دیدہ ہو جاتا اور کبھی ایسا چٹکلہ چھوڑ جاتے کہ سب لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے: استاذِ محترم کسی سے گفتگو فرما رہے تھے، اور طلبہ بھی وہیں حاضر تھے، مخاطب نے کہا: مولانا! کوئی شعر سنا دیں، تو طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا: سناؤں؟ آواز آئی: جی ارشاد، ارشاد! پھر دنیا کو بے وفا دوست سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا:

ہر ہیرا چمکدار نہیں ہوتا ، ہر سمندر گہرا نہیں ہوتا
میرے دوست سنبھل کر چلنا! ہر دوست وفادار نہیں ہوتا

طلبہ نے ''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ'' کہہ کر داد وتحسین پیش کی۔

ایک لمبے عرصے تک آپؒ کی گفتگو سننے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، آپ ہمیشہ خوبیاں ہی خوبیاں بیان کرتے، اور اگر کوئی اس قسم کا موضوع چھیڑتا جس سے بدگمانی پیدا ہو جائے تو فوراً موضوع کا رخ بدل دیتے۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: آپ کا اندازِ گفتگو

بہت ہی نرالا تھا، سفر میں اکثر آپ کے ساتھ جانا ہوتا، جتنے آپ کے ہمراہ اساتذہ وغیرہ ہوتے، منتظر رہتے کہ اب مولانا کیا کہیں گے۔ایک مرتبہ امتحان لینے کے لیے جانا تھا، جمعرات کی شام ہی سے نکل گئے تھے، دیر بہت ہوگئی، پھر بھی گاڑی وغیرہ نہ ملی، ہم ایک جگہ کھڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف کچھ غیر مسلم بھی تھے، اب ڈاڑھی، ٹوپی دیکھ کر کوئی گاڑی بھی نہیں روک رہا تھا، بہت دیر کے بعد ایک ہندو آیا اور اس نے ہم کو بٹھالیا، بہت مالدار تھا، وہ چنے کھا رہا تھا، سب منتظر تھے کہ مولانا کیا کہیں گے۔استاذِ محترم نے بڑے نرالے انداز سے فرمایا: નામદાર ! તમારૂં શુભ નામ શું છે ? یہ جملہ سن کر وہ بڑا متاثر ہوگیا اور پھر سب کو چنے تقسیم کرنے لگا۔

زبان کی حفاظت

بندہ کو مستقل ایک سال آپ کی خدمت کا شرف حاصل رہا، دورانِ سال کئی مرتبہ آپ کے گھر جانا ہوتا، علاوہ ازیں درسگاہ میں بہت کچھ سننے اور سیکھنے کا موقع ملتا، جس میں اکابر کے واقعات ہوتے، عمدہ ومعنی خیز چٹکلے ہوتے، ادبی جملے ہوتے، تعبیرات سے مزین دلچسپ اشعار ہوتے، اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ہوتی، بڑوں کے اکرام کی باتیں ہوتیں، نہ ہوتی تو فقط غیبت نہ ہوتی، دل آزاری و دل شکنی نہ ہوتی، زبان کے تیز خنجر سے کسی کی عزت پامال نہ ہوتی، بدکلامی نہ ہوتی، کسی پر بے جا تبصرے نہ ہوتے، ایک دوسرے کے متعلق بدگمانیاں نہ ہوتیں۔

آپ کے ایک شاگرد نے مجھ سے بیان کیا کہ استاذِ محترم نے مجھ سے

ایک مرتبہ کہا تھا: ''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میری زبان کبھی کسی کے خلاف چلی ہو۔ سچ کہا تھا شاعر نے

تراطرزِ ادا ساقی! دلوں کو گدگدائے گا		ترا دنیا سے اٹھ جانا زمانے کو رلائے گا

تقریر وخطابت کا ہنر

آپ کو باقاعدہ اجلاس وغیرہ میں تقریر کرتے تو نہیں دیکھا؛ مگر تقریر کا گُر اچھی طرح جانتے تھے، کہ کس طرح تقریر وخطابت میں تاثیر ورقّت انگیزی پیدا کی جائے، دلوں کو کس طرح زیروزبر کیا جائے، آپ قلب کی سرد انگیٹھیوں کو سلگانے اور جذبات کے آتش کدوں کو سرد کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ الفاظ کی لہروں کے ساتھ آواز کا تلاطم، خطیب کے چہرے کے نقوش اور اس کے چشم وابرو کے اشارے کی شمولیت باقاعدہ سکھلاتے۔

غالباً بدھ کا دن تھا، استاذ کی طبیعت میں انشراح تھا، چنانچہ خطیبانہ انداز میں تقریباً بیس یا پچیس منٹ تک علم کے جواہر پارے بکھیرتے رہے، ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے کوئی ماہر خطیب تقریر کر رہا ہے۔ جب فارغ ہوئے تو کہنے لگے: یہ بھی ایک فن ہے، اس کے بھی اصول ہیں۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا: جو آدمی یہ سیکھ جائے، اس کو لڑکی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، لوگ خود بہ خود سامنے سے آئیں گے اور کہیں گے: مولوی صاحب! آپ ہماری لڑکی سے نکاح کرنا پسند کریں گے؟ پھر سنجیدگی کے ساتھ فرمایا: ''تقریر میں بھی محنت کرو، اس (آج کی)

جمعرات کا مسئلہ تو حل ہوگیا، جو آج درسگاہ میں تقریر ہوئی اس کو وہاں (انجمن میں) پیش کردو، کافی ہے؛ لیکن مستقبل میں اچھا خطیب بننے کے لیے خوب محنت کرو، ہر چیز دھیرے دھیرے سیکھی جاتی ہے"۔ آپ نہ صرف ایک اچھے خطیب و واعظ تھے؛ بلکہ خطیب گر اور واعظ ساز تھے، اپنے خُردوں میں اچھی تقریر کرنے والوں کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے۔ بسا اوقات حوصلہ افزائی اور ذرّہ نوازی کا یہ سلسلہ اتنا بڑھ جاتا کہ چھوٹے شرمندگی محسوس کرتے۔

اس سلسلے میں مفتی محمود بارڈولی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ: آپ تقریر بھی اچھی کرتے تھے، کئی مرتبہ آپ کے ساتھ سفر میں جانے کا شرف حاصل ہوا، ایک مرتبہ گوئما تشریف لے گئے تھے، تو وہاں ایک مولوی صاحب نے اعلان کیا کہ جامعہ ڈابھیل سے علمائے کرام آئے ہوئے ہیں، انشاء اللہ بقیہ نماز کے بعد بیان ہوگا، لیکن مولانا تو فرض کے بعد ہی کھڑے ہو گئے؛ تاکہ مجمع نکل نہ جائے، چونکہ چندہ کے سلسلہ میں گئے تھے، ہر ایک تک بات پہنچانی تھی۔ پھر آپ نے خطبہ دیتے ہوئے قرآنِ کریم کی آیت: ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ [البقرہ:۲۶۱] ترجمہ: جو لوگ اللہ کے راستے میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے (اور) ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے (ثواب میں) کئی گنا

اضافہ کردیتا ہے۔ اللہ بہت وسعت والا (اور بڑے علم والا ہے)۔[توضیح القرآن] کی تلاوت فرمائی اور اس کی روشنی میں عمدہ انداز میں تقریر فرمائی، جس میں آیتِ کریمہ کی بہترین و پُرلطف تشریح بھی فرمائی۔

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمٰن صاحب سملکی مدّظلّہ فرماتے ہیں کہ: ''مولانا مرحوم اپنے شاگردوں کی تقریر میں بھی شرکت فرماتے تھے، بلکہ میرے بیانات میں بھی شرکت کرتے، بیان کے بعد خوب دادو تحسین پیش کرتے، اور کہتے: کہیں بھی آپ کا بیان ہو مجھے ساتھ لے جانا''۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں: ''وہ تو میرے استاذ کے درجہ کے تھے، میں کیسے ہمت کرسکتا تھا کہ مولانا مرحوم کو ساتھ لے جاؤں! بسا اوقات آپ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرماتے: آپ کے بیان کی یہ خصوصیت ہے کہ جہاں سے شروع کرتے ہو وہیں واپس آتے ہو، یعنی ایک ہی مضمون پر بیان کرتے ہو''۔

شعر گوئی

اس میں کوئی شک نہیں کہ اشعار سے دلوں کی دنیا بدل جاتی ہے، اور بسا اوقات صرف ایک برجستہ شعر سے دلوں میں انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ حدیث شریف مشہور ہے: اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَةً، استاذِ محترم بھی شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے، آپ کی شعر گوئی کے چرچے تھے، ہر کوئی آپ سے مل کر شعر سننے کا مشتاق ہوتا، آپ کو برجستہ اشعار کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ جس کا اندازہ

ذیل میں آنے والے واقعات سے لگایا جاسکتا ہے:

ایک مرتبہ کا ذکر ہے آپ ڈابھیل سے نوساری جانے کے لیے سواری کے انتظار میں شارعِ عام پر کھڑے ہوئے تھے، اسی اثنا میں ایک رکشہ والا حاضرِ خدمت ہوا، اور کہنے لگا: مولانا! کہاں جانا ہے؟ آپ نے کہا: نوساری۔ وہ کہنے لگا: لے جاؤں گا؛ مگر ایک شرط یہ ہے کہ آپ مجھے اشعار سنائیں گے۔ آپ نے تواضع کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: میں کیا اشعار سناؤں گا؛ لیکن چونکہ آپ کے شعری ذوق کا چرچا ڈابھیل گاؤں میں مشہور تھا، اور وہ رکشہ والا بھی واقف کار تھا، وہ اصرار کرنے لگا۔ بالآخر آپ تیار ہوگئے اور کہا: چلو بھائی! ٹھیک ہے، جب سواری ہوا سے باتیں کرنے لگی، تو آپ نے موقع کا فائدہ اٹھا کر رکشہ ڈرائیور سے برجستہ فرمایا: میاں! یہ شعر سن لو:

یہ گاڑی نہیں بھائی! تیری قسمت کا پھول ہے
اسے حد سے زیادہ نہ بھگاؤ گورنمنٹ کا رول ہے

آپؒ کے مستعمل اشعار

جب تعطیلات کا موقع ہوتا، تو طلبہ حاضرِ خدمت ہوکر دعاؤں کی درخواست کرتے اس موقع سے آپ یہ شعر پڑھتے:

اگر گرے شبنم پتّی پر تو پتی نم نہیں ہوتی		جدائی لاکھ ہو؛ مگر محبت کم نہیں ہوتی

جب کسی موقع پر فریب ودھوکا دہی کا تذکرہ چھڑتا تو یہ شعر پڑھتے:

مطلب کی دنیا میں نہ جانے کون کس کا ہوتا ہے
دھوکا وہی دیتا ہے جس پر بھروسہ ہوتا ہے

حاملینِ قرآن کی فضیلت کو اجاگر کرتے ہوئے یہ شعر پڑھتے:

سمندر کی کشتی پہاڑوں پر چل نہیں سکتی
جس کے سینے میں ہو قرآن اس پر تلوار چل نہیں سکتی

مشیتِ خدا کو اس طرح بیان فرماتے جس میں تقدیر کا درس مضمر ہوتا:

مدّعی لاکھ برا چاہے کیا ہوتا ہے		وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

آخرت کو یاد کر کے یہ شعر پڑھتے:

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے		زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

قناعت پسندی کی طرف اس شعر سے اشارہ فرماتے:

کسی کی دولت دیکھ کر حیران مت ہونا		خدا تجھے بھی دے گا پریشان مت ہونا

رزق کے متعلق یہ شعر اکثر کہا کرتے تھے:

رزق اڑ اڑ کے آتا ہے جو مقدر کا ہوتا ہے
پَر دے دیے ہیں میرے رزّاق نے ہر دانے کو

مقدر کی روزی کے سلسلے میں یہ شعر کہا کرتے تھے:

آسمان کے تارے کوئی گن نہیں سکتا		مقدر کی روزی کوئی چھین نہیں سکتا

ظالم کی دلی ظلمت کو اس طرح بیان کرتے:

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیّت		نہیں کام آتی دلیل اور حجّت

جس وقت بادشاہِ سکندر کا تذکرہ ہوتا، تو اس کی زندگی کا خلاصہ اس شعر میں بیان کرکے ہمیں آگاہ کرتے:

جب جائے گا تو یہاں کچھ بھی نہ ہوگا		دو گز کفن کا ٹکڑا تیرا لباس ہوگا

اپنے پرانے بے وفا دوستوں کو ازراہِ مزاح اس طرح مخاطب کرتے:

کبھی کنکر نکلتے ہیں کبھی پتھر نکلتے ہیں
جسے ہم اپنا سمجھتے ہیں وہی دشمن نکلتے ہیں

مجھے تو اپنوں نے لوٹا غیروں میں کہاں دم تھا
میری کشتی وہاں ڈوبی جہاں پانی کم تھا

حق کی حفاظت اور اس کی پاسداری کا فریضہ خود ربِّ ذوالجلال نے لے رکھا ہے، یہ مضمون سمجھاتے وقت اکثر یہ شعر پڑھتے:

نورِ حق، شمعِ الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون		جس کا حامی ہو خدا، اس کو مٹا سکتا ہے کون
فانوس بن کر جس کی حفاظت ہوا کرے		وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

عمل کی ترغیب اس شعر کے ذریعے دیتے:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری

زندگی کا خلاصہ اس شعر میں بیان کردیتے:

آئے تو سنی اذان و اقامت، گئے تو پڑھی نمازِ جنازہ
کتنا قلیل وقت ہے آئے اور داغِ مفارقت دے گئے

خادم سے غلطی ہونے پر مسکرا کر فرماتے:

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد
عقل آتی ہے انسان کو ٹھوکر کھانے کے بعد

دورانِ سبق طلبہ کی خشک و بنجر زمین کو اس شعر سے لالہ زار بناتے:

جو کچھ ہم پڑھتے ہیں اسے بھلا دیتے ہیں
لیکن ''بوٹی'' کی حدیث اور شرح یاد رکھتے ہیں

گنہگار انسان کی نادانی پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے:

ہنسی آتی ہے مجھے حضرتِ انسان پر
کارِ بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

کبھی اس طرح اشعار نوٹ کر کے رکھتے، اور موقع پا کر طلبہ سے پڑھواتے، دشمن کی چالوں پر چند اشعار ملاحظہ ہو:

مکار دنیا سے کہاں جنگ چھڑ آئی		آہ! دکھتی رگوں پر نمک پاشی کرائی
غداروں کے سینے سے سدا ابھرتی ہے بے وفائی خوشا قسمت کہ ہم ہیں اخلاق کے شیدائی		

نمک حراموں کی حالیہ ماضی دہرائی		آئندہ کے لیے بچنے کی راہ دکھائی
پس چمچوں کی فقط تین دوائی:		جوتا، چپل اور کرو سخت پٹائی
گرنہ مانیں فوراً کرو خوب دھلائی		چمچہ گیر پھر کبھی نہ کرے دُہائی

(از: شاعر اداس)

آپ کے شاگرد حضرت مولانا یوسف بھولا صاحب مدّظلّہ العالی رقمطراز ہیں: ایک مرتبہ استاذِ محترم نے فرمایا: شاعر بھی عجیب ہوتے ہیں، ایک شاعر جارہا تھا، ایک خاتون بال جھاڑ رہی تھی، شاعر تھوڑی دیر رک گیا، جب اس نے بال جھاڑ لیے تو شاعر نے کہا:

حنا کے سرخ ہاتھوں نے سیاہ بادل برسایا
جب برس کر ہٹ گئے تو ماہتاب نظر آیا

شعر گوئی کے سلسلہ میں استاذِ محترم مفتی عرفان احمد مالیگانوی مدظلّہ فرماتے ہیں کہ: ''دورانِ درس اشعار بھی خوب سناتے تھے، آپ کا ایک شعر بہت مشہور تھا:

سَر پہ چڑھا وہ پھول جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

شعر کہنے کے دوران کسی کو دیکھ لیتے کہ وہ اسے قلم سے لکھ رہا ہے تو شعر ادھورا چھوڑ دیتے اور فرماتے: ''یہ کوئی لکھنے کی چیز نہیں ہے، تم لکھتے ہو، جاؤ میں نہیں سناتا''۔ یہ کہہ کر سبق پڑھانے لگتے، پھر دیگر طلبہ بیک آواز کہتے: استاذ!

استاذ! سنا دیجیے، اب نہیں لکھیں گے، تو پھر سنا دیتے۔ اس طرح تھوڑا ناز و انداز بھی چلتا رہتا تھا''۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ کا پڑوسی کسان ہندوستان چھوڑ کر بیرونِ ملک چلا گیا، اور جب کئی سالوں کے بعد مغربی تہذیب کے مطابق بن ٹھن کر اور ٹائی وائی لگا کر حضرت الاستاذ کے پاس آیا تو شعر کا مطالبہ کیا، آپ کچھ دیر کے لیے سر بہ گریباں ہوئے اور سر اٹھا کر یہ شعر پڑھا:

ٹائی وائی لگا کر مانا بن گئے جناب ہیرو
رہے پڑھائی لکھائی میں زیرو زیرو

اس سلسلے میں مولانا عبد الرحمٰن صاحب اودگاؤں مدظلہ رقمطراز ہیں کہ:
''حضرت الاستاذ اشعار سے کافی لگاؤ رکھتے تھے، بہت بڑی تعداد اشعار کی زبانی یاد تھی، اسباق میں بھی موقع بہ موقع اشعار سناتے رہتے تھے''۔

لطائف وظرائف

لطائف وظرائف سے مجلس کو قہقہہ زار کرنا آپ کا نمایاں وصف تھا، بوجھل طبیعت میں حسّاسیت پیدا کرنے کے لیے آپ کے لطائف کو پڑھا جائے تو کافی ہے۔ اس کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن نمونہ کے طور پر کچھ جھلکیاں دکھائی جارہی ہیں:

حضرت مفتی محمود بارڈولی مدظلہ العالی نے راقم سے کہا کہ: اس کتاب میں

حضرت مولانا کا ایک مستقل باب ظرائف ولطائف کا ہونا چاہیے، عجیب وغریب انداز تھا۔ تو لیجیے مفتی صاحب کی شیریں زبان سے سنئے، فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ مولانا اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ویزا کی کارروائی کے خاطر گئے، تو ایم بی سی میں کوئی خاتون تھی، اس نے پوچھا: آپ کے کتنے لڑکے اور لڑکیاں ہیں؟ تو آپ نے کہا: بارہ۔ تو وہ تعجب سے پوچھنے لگی: آپ کی کتنی بیویاں ہیں؟ تو اس وقت خالہ پڑوس ہی میں تھیں، کہنے لگیں:. બહેન બધા મારા જ છે(سب میرے ہی ہیں) اس پر اس نے ہنستے ہوئے فوراً ویزا لگا دیا''۔

مفتی صاحب مدظلّہ فرماتے ہیں کہ: ''طلبہ سے مزاح بھی بہت فرمایا کرتے تھے، میں تو مولانا ابراہیم صاحب کاویؒ کے پاس پڑھتا تھا، اور بھڑکودرا کا ایک غبی طالب علم آپ کے پاس پڑھتا تھا، مولانا اس سے بہت بے تکلف تھے، ایک مرتبہ پوچھنے لگے: بیٹا! فارغ ہونے کے بعد کیا کروگے؟ تو وہ کہنے لگا: استاذ میں ایک کمزور طالب علم ہوں، کسی مسجد میں امامت کراؤں گا، اور مکتب پڑھاؤں گا۔ مولانا نے فرمایا: ارے ایسا مت کہو، عزائم اونچے رکھو، کہو! میں ''شیخ الحدیث'' بنوں گا، تو اس نے کہا میں شیخ الحدیث بنوں گا، تو مولانا نے بطور مزاح کے کہا: بھئی! آئینہ میں منہ دیکھا ہے، جو کہہ رہا ہے کہ میں شیخ الحدیث بنوں گا''۔ اس پر درسگاہ میں ہنسی کا فوارہ چھوٹا۔ یہ تو بطورِ مزاح کے فرمایا تھا، ورنہ حوصلہ افزائی میں آپ نہایت ممتاز تھے، جیسا کہ ماقبل میں گذر چکا۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ: ’’ہر سال دو مرتبہ یا کم از کم ایک مرتبہ پوری درسگاہ کے پیچھے ٹپائی لے کر دوڑتے تھے، اور پہلے سے کہہ دیتے، دیکھو! جب بھی غصہ ہو جاؤں تو فوراً بھاگ جانا؛ ورنہ جو ہاتھ لگا اس کی خیر نہیں۔ ایک مرتبہ مہتمم صاحب مولانا سعید بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے جب اس منظر کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے کہنے لگے: مولانا! تم طلبہ کے ساتھ کبڈّی کھیلتے ہو!!‘‘۔

نیز اس سلسلے میں حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

’’ایک مرتبہ ایک جگہ جانا ہوا، تو ایک آدمی آپ کو دیکھتے ہی لگ لپٹ کر خوب رونے لگا، اس سے پوچھا: بھائی! کیا ہوا، ذرا بتادو، پھر مجھ سے لگ لپٹ کر رونے لگا، بار بار کے استفسار پر بتایا کہ انگلینڈ میں میرے رشتہ داروں کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا، پھر خوب رونے لگا، استاذ پر بھی غمی کے آثار طاری ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے اس گمان کے ساتھ کہ گویا کوئی نہ کوئی تو اس حادثہ میں واصل بحق ہو گیا ہے، اس لیے یہ اتنا بلبلا رہا ہے، مجھ سے کہا: دعا کرواؤ، اور مغفرت طلب کرو۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں دعا کروانی شروع کی، اور یہ نیت کی کہ مرحوم کی مغفرت ہو جائے، اسی مناسبت سے ’’اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا اِلٰی اٰخِرِہٖ‘‘ پڑھی۔ جب میں دعا سے فارغ ہوا تو وہ استاذ سے کہنے لگا: اتنا کچھ نہیں ہوا، صرف ایکسیڈنٹ ہوا ہے، تھوڑے بہت زخم آئے ہیں، سب ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ یہ سن کر ہم دونوں ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہ گئے، پھر استاذ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے:

ماشاءاللہ! بڑی جامع دعا ہوئی کہ زندوں اور مُردوں سب کو شریک کرلیا گیا''۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ لکھتے ہیں کہ: ''آپ مکاتب کے تعلق سے بڑے فکرمند تھے، پورا نظم ونسق عمدہ انداز میں فرماتے، امتحان کے لیے جاتے وقت اگر کوئی بے تکلف دوست تاخیر سے آتا تو چھیڑتے ہوئے فرماتے: غسل کرنے میں دیر ہوگئی ہوگی۔

قاری صاحب مدظلّہ مزید لکھتے ہیں: ایک مرتبہ میرے پاس اپنی اولاد کا شجرہ بنا کر بھیجا جس میں ترتیب وار لڑکے اور لڑکیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، اخیر میں ایک خانہ خالی رکھا تھا، جس میں لکھا ہوا تھا ''ابھی امید ہے''۔

حضرت قاری محفوظ الرحمن صاحب ڈابھیلی مدظلہ فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ عطر لگانے کے لیے دیا، پھر خود پوچھا: کہ آپ نے عطر کا نام نہیں پوچھا؟ میں نے کہا: آپ ہی بتادیں کہ عطر کا نام کیا ہے؟ تو فرمایا: مَفّت لال، یعنی ہدیہ والا عطر ہے''۔

قاری شبیر احمد صاحب مدظلّہ ایک اور لطیفہ لکھتے ہیں: ''ایک مرتبہ کسی کے گھر جانا ہوا، تو وہاں پنکھا بند پایا، پنکھا اس طرح تھا کہ اگر اس کو چلانا ہو تو لکڑی سے دھکّا دینا پڑتا تھا، اور یہ نوبت بار بار آرہی تھی، جب حضرت مولانا نے دیکھا تو بہت عجیب انداز میں فرمایا: اوہ اوہ! یہ پنکھا بھی بیوی کی طرح روٹھ جاتا ہے۔
مجلس لگی ہوئی تھی، پہلے خود ہنس پڑے اور پھر مزاحیہ انداز میں یہ شوشہ چھوڑا، جس سے اہلِ مجلس بھی خوب ہنسے''۔

''ایک مرتبہ ڈابھیل سے واڈا گاؤں امتحان کے لیے جا رہے تھے، راستہ پیچ وخم والا تھا، تو آپ کہنے لگے: قاری صاحب! گاڑی سنبھال کر چلانا، راستہ تو بالکل جلیبی نما ہے، پتہ نہیں کون کب سامنے سے آ جائے''۔

مولانا عبید اللہ بارڈولی زید مجدہ فرماتے ہیں کہ: ''ایک مرتبہ رفیقِ مکرّم مولانا محسن صاحب کو پانی لینے کے لیے بھیجا، اس وقت بارش کا موسم تھا، جس کی وجہ سے پانی قدرے سرخی مائل ہوتا تھا، مولوی محسن پانی لے کر درسگاہ میں آئے، پھر اچانک دیکھا کہ پانی لال لال نظر آ رہا ہے، دوسرا لینے کے لیے واپس ہو رہے تھے کہ استاذِ محترم نے دیکھ کر بلا لیا، اور فرمایا: کیا ہوا؟ تو انھوں نے کہا کہ: پانی لال ہے، تو استاذِ محترم نے کہا: لا، تو بھی کیا عورت کی طرح لال پیلا دیکھتا رہتا ہے اور پانی پی گئے''۔

یقیناً آپ کا مزاج بڑا عجیب وغریب تھا۔

چھیڑی غزل جو اس نے تو پہلے ہنسا دیا		پھر ایسی تان لی کہ رلا کر سلا دیا

اس شعر کے پہلے مصرع کی جھلکیاں تو آپ دیکھ چکے، دوسرے مصرع کی چند جھلکیاں ان شاء اللہ ''خشیتِ الٰہی'' کے عنوان کے تحت ذکر کی جائیں گی۔

حاضر جوابی

حاضر جوابی آپ کا طرۂ امتیاز تھا، مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق باتوں کا چٹکیوں میں حل نکال لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آ کر آپ سے

کہا کہ: طلبہ پڑھتے وقت ہلتے کیوں ہیں؟ آپ نے اس کو از راہِ مزاح جواب دیا کہ: جب ڈبّہ میں شکر وغیرہ کوئی چیز بھرتے ہیں، اور وہ بھر جاتا ہے تو اس کو ہلاتے ہیں؛ تا کہ کسی طرح کچھ جگہ نکل آئے، اور ساری کی ساری شکر ایک ہی ڈبّہ میں جمع ہوجائے، اسی طرح طلبہ بھی ہلتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ خوب علم سے بھر جائیں، اور ہر فن سے آراستہ وپیراستہ ہوجائیں۔

اسی طرح کسی صاحب نے آپؒ کو کہا کہ: آپ شافعی، حنفی، حنبلی، مالکی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا: اگر پانی کو سرخ بوتل میں ڈالوگے تو سرخ نظر آئے گا، زرد بوتل میں ڈالوگے تو زرد نظر آئے گا، اسی طرح حنفی شافعی وغیرہ مسالک ہیں کہ جس نظریہ سے ان کا معائنہ کرو اسی طرح نورِ بصیرت میں جچے گا۔

جس وقت آپؒ کی پوتی (حافظ اسماعیل صاحب کی دخترِ نیک اختر) کا نکاح تھا، اس موقع سے لندن جانا طے پایا، ویزا کی کارروائی کے لیے بمبئ جانا ہوا، چونکہ وہاں ''ایم بی سی'' والے سوالات کرتے ہیں، تو آپ سے بھی سوالات کیے، اس میں ایک سوال یہ بھی تھا: آپ کو لندن کیوں جانا ہے؟ آپ نے فرمایا: لندن کی بہت خوبیاں سن رکھی ہیں، اور وہاں کی صاف صفائی اور اچھے معاملات کا تذکرہ کرکے کہا: وہاں ہمارے گھر شادی بھی ہے۔ انھوں نے کہا: ہمیں یقین نہیں ہے کہ آپ واپس آئیں گے، اس کا آپ کے پاس کوئی جواب ہے؟ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا: کیا میں نظم میں جواب دوں یا نثر میں؟ افسر نے کہا: نظم میں، تو آپ

نے اپنے دلکش لہجے میں جواب دیا:

ہمیں دنیا سے کیا مطلب مدرسہ ہے وطن اپنا
مریں گے ہم کتابوں پر ورق ہوگا کفن اپنا

اس شعر کو سن کر افسر بہت خوش ہوا، اور فوراً سکہ لگا دیا۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ: جب مولانا لندن سے واپس تشریف لائے تو کسی نے پوچھا لندن کو کیسا پایا؟ تو آپ نے کہا: ''۳۲؍ دانت صحیح سالم لے کر گیا تھا، انڈیا آ کر مصنوعی لگوانے پڑے''۔

آپ خدمات کے آئینہ میں

استاذِ محترم نے جو خدمات انجام دیں، وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، آپ کی خدمات کی ایک لمبی فہرست ہے، جامعہ ہو، یا جامعہ کے اساتذہ ہوں، طلبہ ہو یا طلبہ کے والی ہوں، خادم ہو یا مخدوم، ہر ایک کے مسئلہ کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش فرماتے۔ ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ ''خادم'' لکھا کرتے تھے، جامعہ کے جتنے بھی رجسٹر آپ سے متعلق تھے جب ان کو الٹ پلٹ کر دیکھا گیا تو ہر جگہ ''خادم'' اور ''عفی عنہ'' لکھا ہوا ملا، اور یہ صرف لکھنے تک محدود نہ تھا، زندگی کا ہر لمحہ آپؒ کے بے لوث خادم ہونے پر شاہدِ عدل ہے۔

راقم نے آپ کی زندگی کا جب مطالعہ کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس خادمِ دین کی ایک پہچان تھی، ان کا اپنا ایک منفرد انداز تھا، ایک طرف تو ان کے پیچیدہ

حالات تھے اور دوسری طرف خدمتِ خلق کے بیسیوں کام، اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ سب کو کماحقہٗ پایۂ تکمیل تک پہنچانا، جگر گردے کی بات تھی۔ آپ نے اپنی تمام علمی وفکری صلاحیتوں کو خدمتِ خلق میں صرف کیا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ کی زندگی کا ماحصل شاعر کی زبانی کچھ اس طرح تھا:

میری تمنا ہے کہ میں کسی کے کام آؤں
میں چراغِ رہ گذر ہوں مجھے شوق سے جلاؤ

دین کی خدمت کے ہزاروں گوشے اور سینکڑوں شعبے ہیں، جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں، لیکن آپ نے ایک جگہ رہ کر دینی اعتبار سے انتھک محنت و جانفشانی سے اردگرد کے خشک وبنجر علاقوں میں جو کام کیا، اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں: ''حضرت مرحوم نے اپنی پوری زندگی جامعہ کی اور لوگوں کی خدمت ہی میں گزاردی، تنگی، پریشانی، بیماری وغیرہ کا خیال بھی نہ فرمایا، بلکہ ہمیشہ اسی کو مدِّ نظر رکھا کہ اپنی ذات سے کسی کو نفع پہنچے''۔ ایک اَور جگہ لکھتے ہیں: ''غلّہ اسکیم کا اہم کام حضرت مرحوم کے سپرد تھا، جس کو آپ آخر تک نبھاتے رہے، اسی طرح مکاتب کو بھی ترقی کی راہ پر گامزن کیا''۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: جامعہ میں جو حضرات نئے داخلہ کے متمنی ہوتے، اور فارم وغیرہ پُر کرنا نہ جانتے تو آپ کے

پاس آتے اور آپ خالصتاً لوجہ اللہ اس خدمت کو بخوبی انجام دیتے۔

نیز جامعہ میں پہلے اوقات کی تعیین اور گھنٹوں کی تبدیلی پر گھنٹی دربان نہیں بجاتے تھے، بلکہ کئی سال تک اس خدمت کو بھی آپ ہی نے انجام دیا۔ واقعی آپ بڑے خدمت گزار تھے، آپ کو جو بھی کام سونپا جاتا اس کی ساری فکر اپنے سر اوڑھ لیتے اور دوسروں کو بے فکر کر دیتے''۔

اس سلسلے میں دادی امّاں کا بیان ہے کہ: ''آپ کا خط بہت پاکیزہ، اور تحریر نہایت شائستہ تھی، بہت سارے لوگ خط لکھوانے کے لیے آپ کی خدمت میں آتے، آپ کبھی کسی کو منع نہیں کرتے، ہر ایک کو عمدہ اور اچھے انداز سے لکھ دیتے''۔

خدمتِ اساتذہ

اس سے کس کو انکار ہوگا کہ: حصولِ علم کی راہ میں اساتذہ کی خدمت کا بڑا کردار رہا ہے، قارئین نے گذشتہ اوراق میں ملاحظہ کرلیا کہ استاذِ محترم نے کتنی دلچسپی سے عوام کی خدمت انجام دی، آپ کو یہ جوہرِ گرانمایہ اپنے اجلۂ روزگار حضرات اکابر کی فیضِ صحبت سے ملا، جن میں سرِ فہرست حضرت علّامہ یوسف بنوریؒ، اور مفتئ گجرات حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بسم اللہؒ ہیں''۔

استاذِ محترم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا کہ: ''میں حضرت علّامہ یوسف بنوریؒ کی خدمت میں رہ چکا ہوں۔ تاریخِ جامعہ ڈابھیل میں مذکور ہے کہ: حضرت مولانا یوسف بنوریؒ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ میں ''صدر مدرس'' بن کر جامعہ میں تشریف

لے آئے، اور مجلسِ علمی کے کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ جامعہ کے مدرّس بھی رہے۔ اسی عرصے میں حضرت الاستاذ نے آپؒ کی خدمت کی ہے، چونکہ مولاناؒ کی رہائش گاہ، گاؤں ہی میں تھی۔ اور حضرت الاستاذ ڈابھیل گاؤں ہی کے باشندے تھے، اس لیے حضرت الاستاذ کی آپ کے یہاں بار بار آمدورفت رہی، قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ نے جس وقت جامعہ میں داخلہ لیا، اس وقت سے لے کر حضرت مولاناؒ کی تشریف بَری تک دو سال کا عرصہ خدمت کے لیے میسر آیا ہوگا، واللہ اعلم۔

اس سلسلہ میں آپ کے برادرِ گرامی مولانا یوسف صاحب کیات مدظلّہ فرماتے ہیں: ''میری پیدائش جس وقت ہوئی اُس وقت حضرت مولانا یوسف صاحب بنوریؒ ڈابھیل تشریف لائے تھے، اور ہمارے مکان سے قریب ہی رہا کرتے تھے۔ اُس وقت ڈابھیل گاؤں میں اردو زبان کا اتنا زیادہ رواج نہ تھا، اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوریؒ کی اہلیہ محترمہ بہت اعلیٰ اردو بولتی تھیں، کسی طرح ان کو پتہ چلا کہ میری والدہ اردو اچھی طرح جانتی ہے تو انہوں نے والدہ سے درخواست کی کہ جس وقت مولانا جامعہ میں تدریس کے لیے چلے جائے تو آپ (میری والدہ) ہمارے گھر آ کر ہمارے ساتھ کچھ وقت گزار لیا کرے؛ تا کہ کچھ دل لگی ہو جائے۔ والدۂ محترمہ کو پہلے سے اہلِ علم کے ساتھ رہنے کا شوق تھا، اس لیے ان کی درخواست کو قبول کر لیا، اور اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اس علمی گھرانے کی

خوب خدمت کی، بھائی (مولانا رشید احمد کیات) کا بھی والدہ کے ساتھ آنا جانا رہا، میں تو اس وقت چھوٹا سا تھا، اپنی آنکھوں سے مولانا کو بار ہا اپنے گھر کے پاس سے گذرتے دیکھا، پھر آپ یہاں سے چلے گئے؛ مگر مولانا بڑے احسان شناس تھے، ہمیں آخری لمحات تک نہ بھولے، ہمارے متعلق پوری خبر رکھتے تھے۔ مجھے اس کا اندازہ اُس وقت ہوا جب میں برطانیہ میں مقیم تھا، حضرت کا وہاں سفر طے ہوا اور آپ برطانیہ تشریف لائے، تو آپ نے حاضرین سے سوال کیا کہ ڈابھیل گاؤں کی مریم آپا کے چھوٹے فرزند یہاں مقیم ہیں اور بڑے فرزند وہ تو وہی گاؤں (ہند) میں خدمت انجام دے رہے، تو ان کے چھوٹے فرزند کو کوئی جانتا ہے؟ میرے ہم شناس لوگوں نے اثبات میں جواب دیا، ایک صاحب مجھ کو بلانے کے لیے آئے اور کہا: حضرت مولانا یوسف بنوری فلاں جگہ آپ کو یاد فرما رہے ہیں، میں خوشی خوشی گیا تو مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے، اور سینے سے لگا کر کہا: یہ تو ہمارے گھر کے لوگ ہیں۔ پھر بہت دیر تک حالات دریافت کرتے رہیں، پاکستان سے برطانیہ اور بھی سفر ہوئے، ان اسفار میں میرے یہاں بھی ایک ہفتہ کا قیام فرمایا۔ الحمد للہ! یہ والدہ کی دوررس نگاہوں اور ان کی قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ ہمیں ہمیشہ اکابرین سے جوڑے رکھا، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے منور فرمائیں اور اعلیٰ علّیین میں بلند مقام عطا فرمائیں، آمین''۔

قاری شبیر صاحب نرولی مدظلہ کا بیان ہے کہ: ''آپ مفتی اسماعیل بسم اللہ

صاحب مفتیٔ اعظم گجرات کے خاص شاگرد وخادم تھے‘‘۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ’’استاذِ محترم نے ہمارے دادا مفتی اسماعیل صاحبؒ بسم اللہ کی بھی بہت خدمت کی، دادا جانؒ اکثر سفر میں آپؒ کو ساتھ لے جاتے تھے‘‘۔

اشاعتِ دین کا ولولہ

اشاعتِ دین کی دُھن ہر صبح وشام آپ پر سایہ فگن رہتی، ہر لمحہ ہر گھڑی آپ اسی سوچ وفکر میں رہتے کہ کس طرح چہار دانگِ عالم میں دین کی اشاعت ہو، اس فکر کے تئیں آپ نے اپنا ہدف اپنے پاس ہند و بیرونِ ہند سے آنے والے طلبہ کو بنایا، یہ بات تو واضح ہے کہ ہر جگہ ایک فرد کا پہنچنا مشکل ہی نہیں؛ بلکہ محال ہے، لیکن ایک جگہ بیٹھ کر ہر جگہ کے طلبہ کو دین واشاعتِ دین کے اعتبار سے تیار کرنا آسان ہے؛ اس لیے آپ صرف ان واردین طلبہ کو درس وتدریس کے مراحل سے گزار کر چھوڑ نہ دیتے، بلکہ مختلف اوقات میں ان کو اشاعتِ دین پر ابھارتے رہتے، اور خود بھی درس وتدریس کے علاوہ کئی ایسی جھلکیاں ہمارے لیے بطورِ عبرت چھوڑ گئے کہ چوں وچرا کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔

مسائل کے باب میں شرم وحیا کو بالکل بالائے طاق رکھ کر دین اور اس سے وابستہ چیزوں کو خوب واضح کرتے۔ ایک موقع سے یہ بات چھڑ گئی کہ کتا کس طرح بیٹھتا ہے؟ طلبہ اس سے ناواقف تھے، چونکہ مکروہاتِ نماز میں سے ایک چیز

''اقعاء'' بھی ہے،تو آپ نے باقاعدہ عملاً اس کو کرکے دکھلایا،اور بالکل شرم وعار محسوس نہ کی۔آپ ان چھوٹی چھوٹی دینی باتوں کی افہام وتفہیم کو معمولی نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اس چیز کا آپؒ کے نزدیک بڑا مقام تھا،اور موقع پاکر اس طرح کی نصیحت بھی کرتے تھے کہ:''کسی معمولی کام کو بھی حقیر اور چھوٹا نہ سمجھو،یہ بڑی بڑی نیکیوں کا باعث بن جاتا ہے''۔

دینی حمیت

آپ کے قلب میں دین کی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی،آپ ہمیشہ اللہ کی توفیق اور دین کی گہری نظر کی بنا پر اپنے تئیں ایک طے شدہ منصوبہ کے ساتھ کام کرتے رہے۔اکثر آپ اپنی عالی ظرفی اور خداداد ضبط وتحمل سے ناگوار باتوں کو اس طرح برداشت کرتے تھے کہ گویا آپ کو اس کا سِرے سے کوئی علم ہی نہیں ہے؛لیکن بعض مرتبہ پیمانۂ ضبط سے کچھ قطرے چھلک پڑتے،اور دل کی انگیٹھی کے کچھ شرارے بھڑک اٹھتے،اردگرد بیٹھے ہوئے حضرات اِس دینی حمیّت کے اثرات محسوس کرتے۔شریعت کے کسی بھی حکم کو معیوب سمجھنا آپ کی برداشت سے باہر تھا،اگر اس قسم کی کوئی حرکت صادر ہوتی تو آپ فوراً جلال میں آجایا کرتے تھے۔

ہمہ وقت کام میں مصروف رہنا

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ،قاری رشید بزرگ سملکی کا مشہور مقولہ ذکر فرماتے ہیں کہ:''تین آدمی کی تلاش بہت مشکل ہے،دوتو زندہ ہیں،اور ایک

انتقال کر گئے، بندہ دو زندوں کا نام نہیں لیتا، تیسرے مولانا رشید احمد صاحب کیات ہیں۔ اشارہ اس طرف تھا کہ مولانا کسی نہ کسی کام میں مشغول ہی رہتے ہیں، سفر ہو کہ حضر، جس طرح آدمی روزی تلاش کرتا ہے، روزی بھی آدمی کو تلاش کرتی ہے۔ جہاں سے موت آتی ہے وہاں سے روزی بھی آتی ہے، بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جنہیں کام تلاش کرنا ہوتا ہے؛ لیکن مولانا مرحوم کو کام تلاش کرتے تھے۔ ہمہ وقت مشغول ہی رہتے، ہر کام کو اپنا سمجھ کر کرتے تھے، چاہے کسی کا بھی کام ہو، ان کو سکون واطمینان ہی کام کی انجام دہی سے ملتا تھا''۔

ہر ایک کی خیر خواہی وتعاون کا جذبہ

آپ ہمیشہ ہر ایک کے لیے اچھا سوچتے، کسی کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جاتے، اور اس کی پریشانی کو دور کرنے کی پوری فکر فرماتے، جب تک دوسروں کو راحت میں نہ دیکھ لیتے خود کے کام کو موقوف کر کے اس کی نصرت فرماتے۔ حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''آپ چھٹی کے بعد روزانہ سائیکل سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوتے، اس دوران کسی استاذ کو پیدل دیکھ لیتے تو فوراً سائیکل سے اتر جاتے اور کسی بائیک والے کو آواز دیتے اور کہتے: مولانا کو وہاں تک سوار کر لو۔ دیکھو! کتنی خیر خواہی تھی، اس کی فکر میں رہتے کہ اپنے قول وفعل سے کسی کو نفع ہو۔ حدیث شریف میں ہے کہ: جب بندہ اپنے کسی بھائی کے کام میں مشغول رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے کام میں اس کی مدد

فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے ہر کام میں غیبی مدد نظر آتی تھی، اس کا راز یہی ہے کہ مولانا خود دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔

تعویذات وعملیات

آپ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے عامل بھی تھے، اس راستے سے بھی کئی لوگوں کی خدمت انجام دی۔ اس سلسلے میں حنیف بھائی جو جامعہ میں دفترِ اہتمام کے ملازمین میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ: ’’مولانا کی بات عجیب تھی، ہمارا کام ہمیشہ پورا کردیتے، اگر کوئی خط وغیرہ لکھوانا ہوتا تو میں انہیں سے لکھواتا تھا، مولانا نے کبھی منع نہیں کیا، یہاں تک کہ تعویذ وغیرہ کی ضرورت پڑتی اور میں مولانا سے کہتا تو فوراً حفاظتی تعویذ بنادیتے‘‘۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: ’’مولانا بڑے عامل بھی تھے، اس کے ذریعہ لوگوں کی بہت خدمت کی، وظائف وغیرہ کا بڑا اہتمام فرماتے تھے‘‘۔

نیز حضرت قاری شبیر احمد صاحب نرولی مدظلہ رقم طراز ہیں کہ: ’’مولانا تجربہ کار تھے، ہر قسم کے آدمی سے تعلق تھا، اس لیے بہت ماہر تھے، بیماری کے نسخے اور مسائل کا حل چٹکی میں فرمادیتے، روحانی اور جسمانی امراض کی کتابیں گھر پر موجود تھیں، مستقل کتابوں کا کتب خانہ تھا جس میں اچھی کتابیں تعویذ وعملیات کی بھی تھیں، جس کا نتیجہ تھا کہ روحانی وجسمانی علاج کے متعلق آپ کو بہت معلومات

تھیں، اگر کسی مجلس میں کوئی بیمار دکھائی دیتا تو آپ فوراً دم کر دیتے تھے‘‘۔

حضرت مولانا بشیر صاحب اورنگ آبادی مد ظلّہ العالی فرماتے ہیں:

’’استاذِ محترم میرے خاص سرپرستوں میں شامل تھے، چوں کہ میرے استاذ بھی تھے اور پڑوسی بھی تھے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ہماری اہلیہ محترمہ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی، میں نے علاج ومعالجہ کے سلسلے میں استاذِ محترم سے مشورہ کیا تو کہنے لگے: مولوی بشیر! یہ بہت کڑوا گھونٹ ہے، پھر اس سلسلے میں میرا پورا تعاون فرمایا، اذکار وغیرہ پڑھنے کے لیے دیے اور ہماری اہلیہ کی صحت کے لیے ہر ممکن سعی ورہنمائی کی‘‘۔

مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہٗ لکھتے ہیں کہ: ’’استاذِ محترم تعویذ بھی لکھا کرتے تھے، چناں چہ احقر (عبید اللہ) کو بھی ایک حفاظتی تعویذ لکھ دیا تھا جو اب تک موجود ہے‘‘۔

آپس میں رشتہ داری کا بندھن جوڑنا

آپ بہت تجربہ کار تھے، ہر چیز کی اونچ نیچ کو جانتے تھے، رشتہ داری کے معاملے میں لوگوں کی بہت زیادہ خیرخواہی فرماتے، ڈابھیل گاؤں میں اگر کسی کو اپنی لڑکی یا لڑکے کی شادی کرانی ہوتی تو وہ آپ سے ضرور مشورہ کرتا۔ آپ اپنے شاگردوں کے بارے میں بہت متفکر رہتے تھے، کئی شاگردوں کے مناسب جگہ پر آپ نے نکاح کروائے۔

ایک مرتبہ آپ کے ایک شاگرد آپ سے ملنے کے لیے درسگاہ میں حاضرِ خدمت ہوئے، آپ نے طلبہ سے کہا کہ ان سے ملئے، پھر ان کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے: یہ میرے شاگرد ہیں، ان کا نکاح میرے ہی ہاتھوں ہوا، اور الحمدللہ! خوب محنت سے کام کر رہے ہیں۔ پھر ان کے چلے جانے کے بعد کہنے لگے: ''جس وقت میں ان کے رشتہ کے لیے گیا، تو ان کے خسر وغیرہ ان کے سانولے پن کو دیکھ کر پس وپیش کرنے لگے، لیکن رشتہ داری میں واسطہ بن کر میں گیا تھا تو کہنے لگے: مولانا کو یہاں سے خالی بھیجنا مناسب نہیں ہے، لڑکا اخلاقی اعتبار سے اچھا معلوم ہوتا ہے، پکّی بات کر ہی لیتے ہیں، پھر مجھ سے پوچھا: لڑکا اخلاقی اعتبار سے کیسا ہے؟ میں نے کہا: میرا شاگرد ہے، تو وہ کہنے لگے: پھر تو پوچھنا ہی کیا! فوراً نکاح کی تاریخ لے لی اور الحمد للہ! نکاح ہوگیا، اور یہ صاحب آج کی تاریخ میں نو بچوں کے والد ہیں۔ اس قسم کے بہت سارے نکاح ہم نے کروائے ہیں۔ دیکھو! اپنی ذات سے جتنا ہوسکے اتنی خدمت ضرور کرلینی چاہیے، اگر تمہاری وجہ سے کسی کا کام بنتا ہو تو بنا دینا، نخرے مت کرنا، اللہ تعالیٰ اس کا بڑا اجر دیں گے ان شاء اللہ''۔ دادی امّاں کا بیان ہے کہ: ''بہت سارے لوگ رشتوں کے سلسلے میں آپ کو واسطہ بناتے تھے، اگر باہر جانا ہوتا تو آپ کو لے جاتے''۔

باہمی نزاعات سلجھانا

استاذِ محترم جھگڑے فساد سے بہت اجتناب کرتے تھے، اور اوروں کو بھی

اس سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش فرماتے۔ حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

’’ایک جگہ میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا، بیوی روٹھ کر اپنی والدہ کے یہاں آ گئی، اور جانے کا نام نہیں لے رہی تھیں، اس لڑکی کی والدہ استاذِ محترم کے پاس آئیں، اور کہنے لگیں: آپ اس کو سمجھائیں، استاذ نے مجھ سے کہا کہ: ہم کو فلاں وقت فلاں کے گھر جانا ہے، تیار رہنا، لڑکی روٹھ کر بیٹھ گئی ہے، کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آخر مجھے لے گئے، لڑکی اور اس کی والدہ کے سامنے آپ نے خوبصورت انداز میں اس مسئلہ کے بارے میں افہام وتفہیم کی ابتدا کی، فرمایا: آپ کے لگن جیون کا ہرا بھرا باغ ہمیشہ قائم رہے، تو ہمیں بھی خوشی ہوگی۔ پھر عجیب انداز میں سمجھانے لگے، چونکہ گجراتی میں بھی آپ فصیح گجراتی بولتے تھے، لڑکی اور اس کی والدہ پر بہت اثر ہوا، وہ لڑکی فوراً اپنے میاں کے یہاں جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ معاملات کے سلجھانے کا عجیب ملکہ اللہ نے آپ کو عطا فرمایا تھا‘‘۔

جھگڑے فساد سے اجتناب

ہم نے دیکھا کہ استاذِ محترم ہر جھگڑا فساد والی چیز سے احتراز فرماتے، ایسی کوئی بات ہونے ہی نہیں دیتے تھے کہ جس کی وجہ سے بحث ومباحثہ ہو، بلکہ ایسے موقع پر جھگڑے کے شکار فریقین کو نصیحت کر کے معاملہ کو سلجھا دیتے۔

نصیحت سے بھرپور لطیفہ

ڈابھیل گاؤں کا ایک آدمی دُبلی (مزدور اور نچلے طبقے کے لوگوں کو اس نواح میں ''دبلا'' کہا جاتا ہے) پر فریفتہ ہو گیا تھا، ایک عرصہ سے آپ کو اس کا علم تھا، آپ اس عاشق کو سمجھاتے رہے کہ یہ غلط ہے، گناہ کی بات ہے، لیکن وہ بات سن کر ہمیشہ یہی جواب دیتا: ''مولانا! آپ کی سب بات ٹھیک ہے، لیکن وہ دُبلی میری نظر میں پَری ہے''۔ اس موقع پر قاری شبیر صاحب مدّ ظلّہ فرماتے ہیں: آیاتِ کریمہ ﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ اور ﴿لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ﴾ کی روشنی میں ہمارا کام صرف کہنا ہے، ماننا نہ ماننا سامنے والے شخص کا کام ہے، لیکن ﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ﴾ والا مزاج ہونا چاہیے، جس کی وجہ سے وہ آدمی سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ یہ آدمی میرے نفع کے لیے کہہ رہا ہے، مجھ کو ماننا چاہیے، اور یہ بات یقینی ہے: حق بات حق نیت اور حق طریقے سے کہے اور دل اور درد دِل سے کہے تو ضرور اثر ہوتا ہے۔ مولانا اکثر بڑے مزے سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے		پَر نہیں؛ طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

صلہ رحمی

استاذِ محترم کے اپنے اہلِ خاندان پر بڑے احسانات رہے، تنگی ہو کہ فراخی، ہر حال میں آپ خاندان کے محتاجوں، مسکینوں، یتیموں اور کمزوروں کا پورا خیال فرماتے تھے، ہر نازک موڑ پر ان کی مدد فرماتے، ہر رشتے دار کے ساتھ حسنِ

سلوک سے پیش آتے، وقتاً فوقتاً ان سے مل کر حال احوال دریافت فرماتے رہتے، اور یہ صفت صرف اہلِ خاندان تک محدود نہ تھی، بلکہ قریہ قریہ اس کا شہرہ تھا۔

سخاوت

ابتدائی تنگ دستی کے بعد جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو صاحبِ استعداد بنادیا تو آپ نے اس سے بہت سارے حضرات کی خدمت کی، خصوصاً طلبہ کا اپنے مال کے ذریعہ تعاون فرماتے اور غریبوں کا بھی بہت لحاظ کرتے، کیا عجیب بات ہے کہ: ایک طرف تو پرایوں کو اپنا سمجھ کر ان کے لیے ڈگر ڈگر، نگر نگر جھولیاں دراز کر رہے ہیں، اور دوسری طرف اوروں کی جھولیاں بھر رہے ہیں۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''کسی جگہ آپ کے تعلق والے تھے جن کی رہائش کا کوئی نظم نہ تھا، آپ نے ازخود محنتِ شاقّہ برداشت کر کے ان کے لیے گھر وغیرہ کا انتظام کیا، واقعی آپ نے اندرونی وزمینی کام بہت کیے''۔

ایک طالبِ علم نے مجھ سے کہا: ''میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ مولانا اپنے فرزند کے ساتھ بائیک پر تشریف لائے اور اپنے پاس پڑھنے والے ایک طالبِ علم کو کچھ رقم حوالے کر کے چلے گئے''۔

مہمان نوازی

آپ کا دسترخوان وسیع تھا، ہر آنے جانے والے کو اپنے دسترخوان میں

شریک کرنے کی ہر ممکن سعی فرماتے، ہمیشہ کھلا کر بہت خوش ہوتے، آپ مہمان نوازی میں سنّتِ ابراہیمی پر گامزن تھے، موقع موقع سے طلبا کی دعوت وغیرہ بھی فرمایا کرتے تھے، جو طلبا آپ کی ملاقات وزیارت کے لیے گھر جاتے تو ان کو بھی ضرور اپنے دستر خوان پر مدعو کرتے۔ بندہ کا کئی مرتبہ آپ کے دولت کدہ پر جانا ہوا، آپ بغیر ناشتہ کیے نہ آنے دیتے، بلکہ ایسی مہمان نوازی کا مظاہرہ ہوتا کہ مارے شرم کے سر جھک جایا کرتا تھا، بالکل ایسا برتاؤ کرتے کہ ہم خادموں کو مخدوم بنا دیتے اور خود خادم بن جاتے۔ یہی صفتِ میزبانی آپ کے اہلِ خانہ میں بھی بہت نمایاں ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپ کے بڑے فرزند حافظ اسماعیل صاحب بیرونِ ملک سے والدین کو ملنے کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے، ایک دن استاذِ محترم کے پاس زانوئے تلمذ تہ کرنے والے طلبا کی ملاقات کے لیے آئے، سب سے ملاقات کی، تھوڑی دیر بیٹھے، استاذِ محترم کے حکم کے مطابق چند طلبہ سے کریما و پند نامہ کا سبق سنا، پھر جب سننے سے فارغ ہوئے تو آپ نے استاذِ محترم کے ساتھ دھیمی دھیمی آواز میں گفتگو فرمائی، پھر اخیر میں کہنے لگے: ٹھیک ہے، طلبہ کو اطلاع دیجیے۔ طلبہ یہ جملہ سن کر آپ کی طرف متوجہ ہوئے، اور اس انتظار میں تھے کہ آپ کی زبان سے کیا جملہ نکلتا ہے۔ استاذِ محترم نے تھوڑی دیر توقف کیا؛ تاکہ سننے کا اشتیاق بڑھے اور یقیناً وہ بڑھا، پھر آپ نے طلبہ کی توجہ کو اپنی طرف

مبذول کرتے ہوئے کہا: یہ ہمارے بڑے فرزند ہیں، فی الحال لندن میں مقیم ہیں، کچھ دنوں کے لیے والدین سے ملنے آئے ہوئے ہیں، آپ کا سبق سنا تو بڑا تأثر لیا، پھر استاذِ محترم مسکراتے ہوئے کہنے لگے: یہ آپ کی دعوت کرنا چاہتے ہیں، آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ طلبہ کی تو باچھیں کھل گئیں اور سب نے فرطِ مسرت سے کہا: ہم سب تیار ہیں۔ چنانچہ ایک دن مقرر ہوا، اور طلبہ نے بڑے شوق سے آپ کے گھر دعوت کھائی، اور عمدہ ومتنوع مطعومات ومشروبات سے لطف اندوز ہوئے۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلّہ رقم طراز ہیں کہ: ’’جب بندہ ۱۹۹۰ء میں فارغ ہوا، تو جامعہ میں تقرر کے ساتھ ڈابھیل گاؤں کی جامع مسجد میں امامت کے لیے یاد فرمایا گیا۔ بندہ نے امامت کی ذمہ داری قبول کرلی، ان ایام میں مولانا سے بڑے مضبوط اور گہرے تعلق ہوگئے، مسجد میں آنے جانے کے وقت اکثر محبت بھرے انداز سے ملتے اور گھر لے جاکر ناشتہ وغیرہ کرواتے، آپ بڑے مہمان نواز تھے‘‘۔

حضرت قاری یوسف بھولا صاحب مدظلّہ رقم طراز ہیں: ’’جب بھی میں ہندوستان آتا استاذِ محترم کی ملاقات کرتا، دعا کی درخواست کرتا اور حسبِ استعداد آپ کو ہدیہ پیش کرتا، آپ فرماتے: میری دعوت کھاکر ہی جانا، بہت اصرار فرماتے تھے۔

نیز اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہٗ فرماتے ہیں کہ:

’’طلبہ کے جو والی جامعہ میں تشریف لاتے تو اس موقع پر آپ کا رویہ ان کے ساتھ عجیب والہانہ ہوتا، چناں چہ دیکھا گیا: اگر والی حضرات کھانے کے وقت آتے تو کھانے کی دعوت پیش کرتے، اور اگر دوسرے کسی وقت میں آتے تو چائے ناشتہ ضرور کرواتے تھے، اگر کوئی والی کھانے اور ناشتہ سے منع کرتے تو استاذ بڑے پیارے لہجہ میں فرماتے: دعوت پیش کرنا میرا فریضہ ہے باقی آپ کی مرضی‘‘۔

خواب کی تعبیر دینا

استاذِ محترم سے اکثر لوگ خواب کی تعبیر بھی پوچھا کرتے تھے، آپ بہت ہی بہترین اور مناسبِ حال تعبیریں بتلایا کرتے تھے جو آنے والوں کو مطمئن کردیتی، اگر کسی موقع سے زیادہ مشغول ہوتے تو اپنے ہونہار شاگرد حضرت مفتی عباس صاحب مدظلہ العالی کا حوالہ دیتے، حتی الامکان تخمینہ بازی اور اندھیرے میں تیر چلانے سے احتراز فرماتے۔

استخارہ کا اہتمام

آپ بہت کثرت سے استخارہ فرمایا کرتے تھے اور اوروں کو بھی اس کی ترغیب دیا کرتے تھے، ہمیشہ فرماتے تھے: ’’اگر کوئی کام سمجھ میں نہ آئے تو استخارہ کرلیا کرو، راستہ نکل آتا ہے‘‘۔ کئی طلبا آپ کے پاس استخارہ کرواتے تھے، راقم کا مشاہدہ ہے کہ: ایک روز ایک طالبِ علم آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کچھ سرگوشی کی، پھر کہا: استاذِ محترم! آپ اگر استخارہ فرمالیں تو عین نوازش ہوگی، استاذ

محترم نے کہا: ٹھیک ہے۔ غالباً دو روز کے بعد وہ طالبِ علم پھر درسگاہ آیا، اور ادباً عرض کیا: استاذ جی! کیا آپ نے استخارہ فرمالیا؟ کہنے لگے: جی! والد صاحب سے کہنا: کام شروع کر دیں ان شاء اللہ خیر نصیب ہوگی۔

اکابرِ دیوبند کے ساتھ آپ کی مشابہت

آپ نے اپنی کوئی امتیازی شان نہیں بنائی، نہ کھانے میں، نہ کپڑوں میں، نہ چلنے میں، نہ برتاؤ میں، بلکہ ہمیشہ اکابرِ دیوبند کی زندگی آپؒ کے روبرو ہوتی، اور اسی طرزِ عمل کو نمونہ بنا کر آپ نے اپنی زندگی کی تقریباً نو دہائیاں پوری کیں۔

سادگی کے سلسلے میں مفتی عرفان احمد مالیگانوی مدظلہ اپنے گراں قدر مضمون میں لکھتے ہیں: سفید رنگ کا نیل چڑھا ہوا بالکل سادہ لباس، دو پلی ٹوپی، خطوط کا جھولا اور پرانی سائیکل، بس زندگی بھر استاذِ محترم کی یہی نشانی، بلکہ نشانِ امتیاز رہا۔

صفائی کا اہتمام اور جذبۂ خدمت

راقم نے اپنی ۲۲؍سالہ مختصرسی زندگی میں بہت سے علما دیکھے، لیکن استاذِ محترم جیسا کسی کو نہ پایا۔ بیسیوں بار کتابوں میں پڑھا، اوروں کی زبانی سنا کہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ ٹرین میں سفر کر رہے تھے، پڑوس میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا، آپ نے اس کو کچھ بے چین محسوس کیا، وہ اٹھ کر بیت الخلا کی طرف گیا، لیکن پھر اسی بے چینی کے ساتھ لوٹ آیا، دو تین مرتبہ ایسا ہوا، آپؒ نے

یہ دیکھا تو سمجھ گئے کہ کچھ تو پریشانی ہے، بیت الخلا کی طرف گئے، دیکھا کہ گندگی پڑی ہوئی ہے، خود اپنے ہاتھوں سے اس کو صاف کیا، اور اس آدمی سے کہا: جائیے! میں ابھی جا کر آیا ہوں، بالکل صاف ہے۔

اکابرِ دیوبند کا یہ پڑھا سنا طرزِ عمل میرے لیے اُس دن مشاہدہ بن گیا، جب میں نے پہلی مرتبہ مشفقی و مربی مولانا رشید احمد صاحب کیات کو دیکھا، کہ طلبا تجوید کے گھنٹے سے فارغ ہو کر استاذِ محترم کی درسگاہ میں تشریف لائے، تو آپؒ نے بیٹھنے سے پہلے جھاڑو کی طرف اشارہ فرمایا، اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: چلو! جلدی جلدی صفائی کر ڈالو۔ جب طلبہ صفائی میں مشغول ہوئے تو خود بھی طلبہ کا ہاتھ بٹانے لگے، باریک باریک تنکے اپنے مبارک ہاتھوں سے اٹھا کر کچرے کے ڈبے میں ڈالنا شروع کیا، درسگاہ کی تمام کھڑکیاں کواڑ وغیرہ بھی صاف کرنے لگے، اگر طلبہ کی نگاہ سے کوئی مکڑی کا جالا چوک گیا، تو خود جھاڑو لے کر اس کو صاف کر لیا۔ راقم کو بڑی حیرت ہوئی، لیکن جب بار بار اس کا مشاہدہ ہوا تو حیرت کی جگہ عبرت نے لے لی، کہ تواضع اس کو کہتے ہیں، انکساری ایسے برتی جاتی ہے۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوتا کہ آپؒ درسگاہ میں داخل ہوتے اور دروازے پر تنکا وغیرہ ہوتا، تو آپ فوراً اٹھا لیتے اور کچرے کے ڈبے میں لے جا کر ڈال دیتے، اس چیز کو دیکھ کر طلبہ مارے شرم کے اپنی گردنوں کو نیچی کر لیتے، اور اپنے تئیں یہ سوچتے کہ اب استاذ خفا ہوں گے، اب ڈانٹ پلائی جائے گی؛ لیکن کبھی حرفِ غلط کی طرح بھی

ایسا نہیں کہا کہ تم لوگ صفائی نہیں کرتے ہو، بلکہ ہمیشہ اس قسم کی غفلتوں پر حکمت کے ساتھ عمدہ انداز میں متوجہ کرتے اور فرماتے: ''علم کے آداب میں درسگاہ کا بھی ادب ہے، ہم اس میں پڑھتے، پڑھاتے ہیں، اگر ہم ان ظاہری اسباب کو پاک صاف رکھیں گے تو انشاء اللہ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ہمارے باطن کو بھی صاف ستھرا کردیں گے''۔

صفائی کا یہ معاملہ صرف درسگاہ تک محدود نہ تھا، بلکہ جب بھی آپ کے گھر جانا ہوتا تو وہ انتہائی صاف ستھرا دکھائی دیتا، عموماً دیکھا گیا کہ ہر وہ شخص جو انتہائی نظیف وصاف ستھرا کہلاتا ہے وہ اپنی اٹھک بیٹھک اور رہن سہن میں کوڑا کرکٹ سے گھبراتا، اور اپنے دامن کو اس سے بچاتا ہے؛ حتیٰ کہ کسی جگہ کچرا نظر آئے تو اس کو اٹھانے کے بجائے نکتہ چینی کرتا ہے، لیکن استاذِ محترم کا معاملہ اس سلسلے میں اوروں سے مختلف تھا۔ احادیث میں سرِ راہ پڑی ہوئی مُضِر چیزوں کو اٹھانے اور ہٹانے کی مستقل فضیلتیں وارد ہوئی ہیں، استاذِ محترم کے پیشِ نظر ہمیشہ یہ فضیلتیں رہتی تھیں۔ ایک طالبِ علم کا بیان ہے کہ میں نے مولانا رشید احمد کیات صاحب کو کئی مرتبہ دیکھا کہ جس وقت وہ چھٹی کے بعد گھر جارہے ہوتے تو اچانک بیچ راستے پر سائیکل سے اتر کر کچرا وغیرہ چن کر کچرے کے ڈبے میں ڈالتے، یا کوئی پتھر کانٹا وغیرہ ہوتا تو اسے کنارے کردیتے۔ بعض مرتبہ عقیدت مندوں نے دیکھا کہ سائیکل پر تیز جارہے ہیں، اچانک بریک لگائی اور گٹکا وغیرہ کی خالی پُڑیاں اٹھانے

میں مشغول ہو گئے۔ سچ ہے: ''صاف ستھرا بھارت'' کا نعرہ لگانا آسان ہے؛ لیکن عملی زندگی میں کر دکھانا مشکل ہے۔

اساتذۂ جامعہ سے تعلق ومحبت

یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ ایک قدیم مدرّس عمر وتجربے کے اعتبار سے جدید مدرّس کے ساتھ محبت وربط کا تعلق رکھ کر ان کی خوبیوں کو خوب سراہے، حتیٰ کہ شاگردوں کے ساتھ بھی ایسا تعلق ومحبت کا معاملہ کہ محسوس نہ ہو سکے، کہ آپ کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ تہ کیا ہوگا۔ آپؒ اس نایاب وصف سے آراستہ تھے، وقتاً فوقتاً ہر استاذ کی خیریت معلوم کرتے، اور تدریسی خدمات میں اپنے معاصروں اور خردوں کی بہت تعریف کرتے، اور ان سے استفادہ کے لیے طلبہ کو دعا کی تلقین کرتے۔ اپنے اُن شاگردوں کا بھی تذکرہ کرتے جو جامعہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کا زمانۂ طالبِ علمی بیان کرکے ان کی خوبیاں بیان فرماتے، جس کی وجہ سے طلبہ آپ کے شاگردوں سے بھی بہت محبت کرنے لگتے۔

ایک موقع سے حضرت مولانا اسماعیل صاحب پانڈور مدّ ظلّہ درسگاہ میں تشریف لائے، تو آپ نے فرمایا: ''یہ صوفی انسان ہیں، ان سے استفادہ کیا کرو''۔

اس کے علاوہ ہر ممکن ایسی تدبیر اختیار کرتے جس سے طلبہ کے دل میں اساتذۂ جامعہ کی اہمیت جاگزیں ہوتی، کبھی یہ تدبیر اختیار کرتے کہ: جس علاقہ کا طالبِ علم آپ کے پاس پڑھتا، اور اس علاقہ کے کوئی استاذ جامعہ میں خدمت

انجام دے رہے ہوں، تو ان کے پاس موقع موقع سے سبق یا آموختہ سنانے کے لیے بھیجتے رہتے۔ بندہ نے کئی مرتبہ دیکھا، آپؒ ہمارے دو ساتھیوں کو مولانا سکندر صاحب مدّ ظلّہ (استاذِ حفظ جامعہ ڈابھیل) کے پاس بھیجتے، جو ان ہی کے علاقے کے تھے، اور آپ سے مل کر طالبِ علم کی استعداد بھی معلوم کرتے، اور درسگاہ میں آکر تعریفی کلمات سے نوازتے، اور فرماتے کہ: اور محنت کرو، انشاء اللہ دھیرے دھیرے ترقی تمہارے قدم چومے گی۔ اس سے دو فائدے ہوتے: طلبہ کی حوصلہ افزائی اور اساتذہ سے تعلق و ربط کا پیدا ہونا۔

اس سلسلے میں حضرت مولانا یوسف بھولا مدظلّہ رقم طراز ہیں: ''ایک موقع سے حضرت مولانا ابرار صاحب دھولیویؒ درسگاہ کے باہر سے سبق سن رہے تھے، جب استاذِ محترم کی ان پر نگاہ پڑی تو وہ تعریفی کلمات کہہ کر چلے گئے، لیکن آپؒ نے ان کے چلے جانے کے بعد فوراً فرمایا: دیکھئے! جامعہ میں اوپر کے درجات کے قابل اساتذہ ہیں، ان کی قدر کرلو، پھر چند نام لیے: شیخ الحدیث مولانا ایوب صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا ابرار صاحب دھولیویؒ، حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری ادام اللہ فیوضہم۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ میں معاصرت کا کوئی تأثر اور استنکاف نہیں تھا، بلکہ درجۂ علیا کے اساتذہ کی تعریف کے پل ہمارے سامنے باندھ رہے ہیں، یہی معاملہ اساتذہ کا باہمی ہونا چاہیے، الحمدللہ! میرا تعلق فراغت کے بعد مسلسل سب اساتذہ سے رہا۔ ۱۹۸۵ء میں امریکہ آنا ہوا، اس کے بعد بھی

جامعہ کے اساتذہ سے خط وکتابت رہی، حضرت الاستاذ سے بھی رہی''۔

اسی طرح حضرت قاری شبیر صاحب نرولی مدظلّہ اپنے گرانقدر مضمون میں تحریر فرماتے ہیں: ''ایک واقعہ یاد آیا، ڈرتے ہوئے لکھ رہا ہوں، اپنے شیخ، مربّی ومرشد کے تعلق سے بے ادبی نہ ہوجائے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے جامعہ میں خانقاہی نظام سالہا سال سے جاری ہے، کئی لوگ دور دور سے اعتکاف کے لیے آتے ہیں، اور کچھ لوگ شب کو اطراف سے تراویح پڑھنے اور دعا وبیان میں شرکت کے لیے آتے ہیں، ڈابھیل کے بھی بہت سے حضرات اپنی اپنی مسجد میں تراویح پڑھ کر جامعہ میں دعا اور بیان میں شریک ہوتے ہیں، مولانا مرحوم بھی ہمیشہ شریک ہوتے تھے، استاذی وشیخی حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم دعا فرماتے، پھر بیان فرماتے۔ ایک مرتبہ بیان کے بعد مولانا مرحوم اور بندہ ساتھ ساتھ مسجد سے باہر نکلے، تو مولانا مرحوم نے بندہ سے فرمایا کہ: حضرت کے ملفوظات میں بہت نکھار آ گیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ ان کے شیخ فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کا پورا عکس ان کے اندر سمو گیا ہے، بندہ نے بھی اثبات میں جواب دیا۔ دیکھئے مولانا مرحوم کی نظر! تاجر، تاجر کو، کسان، کسان کو پہنچانتا ہے، تو اسی طرح ولی، ولی کو پہنچانتا ہے، یہ ہے بڑوں کی قدر شناسی، یہ نہیں کہ: میں تو ان سے پہلے سے مدرس ہوں۔ آپ کا یہ طرز ہم کو یہ سبق دیتا ہے کہ بڑوں کی قدر کی جائے۔ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا مدّظلہ کے سایۂ عاطفت کو قائم دائم رکھے اور

ہم کو حضرت کی قدر دانی کرنے اور ان کے ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور جامعہ کو حضرت مرحوم کا نعم البدل عطا فرمائے، اور ہم کو بھی اسی طرح جامعہ کا خادم بنائے، آمین''۔

اساتذۂ جامعہ کا آپؒ سے تعلق

استاذِ محترم جس طرح علم وفن اور عمل وتقویٰ کے شہسوار تھے اسی طرح حسنِ اخلاق اور شرافت اور ظرافت کا بہترین نمونہ تھے، زبان انتہائی شیریں تھی، کڑواہٹ دور دور تک دکھائی نہ پڑتی تھی، جس کا نتیجہ تھا کہ ہر استاد آپ سے قریبی تعلق رکھے ہوئے تھا، ہر ایک کے دل میں آپؒ کا مقام ومرتبہ موجود تھا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب آپؒ کا ذکرِ خیر آتا ہے تو اساتذہ آب دیدہ ہوجایا کرتے ہیں۔

آپ کی تدریسی زندگی میں سینکڑوں شاگردوں نے فراغت کے بعد بھی آپ سے تعلق وربط کے بندھن کو برقرار رکھا، اور آپؒ سے دینی ودنیوی معلومات حاصل کرکے اپنے مستقبل کو سنوارتے رہے۔

دادی امّاں کا بیان ہے کہ: ''آپ سے بہت سارے فضلا ملنے کے لیے حاضر ہوتے رہتے تھے، مفتی عباس صاحب تو بہ کثرت آیا کرتے تھے، ان کا استاذِ محترم سے بہت گہرا تعلق تھا، اور جب آپ بیمار ہوئے تو جامعہ کے اکثر اساتذہ تشریف لاکر آپؒ کی عیادت فرماتے رہے''۔

خود راقم کا مشاہدہ ہے: ''جس وقت استاذ محترم مفتی عبدالقیوم صاحب

کڈی مدظلّہ سے عربی اول پڑھ رہا تھا، تو مفتی صاحب مدظلّہ بہ اہتمام مجھ سے آپؒ کی خیریت معلوم کرتے، اور کہتے: جب گھر جانا ہو تو ضرور میرا سلام عرض کرنا۔ میں خدمت میں حاضر ہوتا، اور مفتی صاحب مدظلّہ کا سلام پہنچاتا، تو استاذِ محترم بڑی خوشی کا اظہار فرماتے اور کہتے: مفتی صاحب سے کہنا: فکر کرنے کی بات نہیں ہے، طبیعت ٹھیک ہے، اور دعا کی درخواست کر دینا۔

اکابر سے تعلق ومحبت

استاذِ محترم کو اکابر سے بھی انتہائی محبت تھی، وقتاً فوقتاً ان کے واقعات سنا کر ہماری خشک زمین کو تر وتازہ رکھتے، خصوصاً ان اکابر کے واقعات جن سے آپؒ کو دلی اعتقاد تھا۔ اس سلسلہ میں حضرات اساتذہ کے عینی مشاہدات وتجربات تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ’’استاذِ محترم کا ہمارے دادا حضرت مولانا مفتی اسماعیل صاحب بسم اللہ سے بہت گہرا تعلق و ربط تھا، آپؒ ان کے واقعات بڑی دلچسپی اور دل کی گہرائی سے سنایا کرتے تھے‘‘۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: ’’آپؒ مولانا سعید صاحب بزرگؒ کے بڑے معتقد تھے‘‘۔

حضرت مفتی محمد حفظ الرحمن صاحب سملکی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ’’اپنے بڑوں کی تعظیم کا جذبہ بھی مولاناؒ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اپنے بزرگوں کا تذکرہ

کان میں پڑتے ہی آپ پر بسا اوقات وجد کی سی کیفیت طاری ہوجاتی، خوب کیف وطرب میں آجاتے اور پرانی یادوں کا ایک طویل سلسلہ شروع فرمادیتے۔ سابق مہتمم میرے نانا جان حضرت مولانا سعید بزرگ صاحبؒ سے انہیں والہانہ تعلق تھا، اِن کے علمی سفر میں حضرت مرحوم کا جو ہاتھ تھا، اور ان کے جو احسانات تھے، انہیں بڑا مزہ لے کر بار بار سناتے۔

خدامِ جامعہ سے تعلق اور ان کا احترام

دیکھا گیا ہے کہ لوگ علما اور اکابرین کی تو خوب عزت کرتے اور احترام سے پیش آتے ہیں، لیکن جب اپنے ماتحتوں یا عام مسلمانوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے تو حسنِ اخلاق کا سارا سرمایہ دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ استاذِ محترم ایسا کبھی نہیں کرتے تھے، بلکہ حسنِ سلوک میں ہر ایک کے ساتھ ان کے مناسبِ حال بہترین معاملہ فرماتے۔ آج کل عجیب حال ہے کہ اگر کسی پر تھوڑا بھی بس چل پڑے تو لوگ اس کو اپنا محتاج بنا کر خوب کام نکال لیتے ہیں، لیکن آپؒ اس سلسلے میں بڑے محتاط تھے، جس کی وجہ سے خدامِ جامعہ کے قلوب بھی آپؒ کی محبت سے سرشار تھے۔

اس سلسلے میں حنیف بھائی خادمِ جامعہ بتلاتے ہیں کہ: ''میرا مولانا سے بہت زیادہ تعلق تھا، مولاناؒ کی ایک بڑی خوبی یہ دیکھی کہ اگر کوئی چیز مجھ تک پہنچانی ہوتی تو خود میرے گھر آ کر دے جاتے، میں مولاناؒ سے کہتا بھی کہ مجھ کو بلوا لیتے! فرماتے: میرا کام اور تم کو بلواؤں یہ عقل مندی کی بات نہیں''۔ اللہ اکبر! کیا سادگی و

انکساری تھی۔

علمائے کرام کا ادب واحترام

استاذِ محترم بڑے ہی با ادب اور قدرشناس واقع ہوئے تھے، اپنی جامعیت اور قابلیت کے باوجود، ہرخُرد وکلاں عالمِ دین، آپؒ کی نظروں میں قابلِ احترام ہوتا، ہرجگہ ہر موقع سے ہر ایک کو احترام سے یاد فرماتے، کبھی کسی کی غیبت، تذلیل اور آبروریزی نہ فرماتے؛ بلکہ عزت واکرام کا ایسا معاملہ فرماتے کہ اگر سامنے والا آپؒ کا شاگرد ہوتا، تو وہ پانی پانی ہوجاتا۔

جب بھی کسی بڑے کے نام کوئی خط یا رقعہ ارسال کرنا ہوتا تو بڑے القاب لکھ کر ان کے ادب کو ہم جیسے نادانوں کے سامنے واشگاف کرتے، اور اگر اپنے شاگرد یا جامعہ کے کسی استاذ کو کچھ لکھنا ہوتا تب بھی ان کے ادب واحترام کا پورا خیال فرماتے۔ ہر ایک کو ان کے مناسب القاب سے یاد کرنا، عزت واحترام کے جذبات ہمارے دلوں میں ابھارنے کے لیے کافی مفید ثابت ہوتا، آپؒ کے ہاتھوں لکھے ہوئے کئی خطوط اور رقعوں کو دیکھنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، ہر ایک پر ادبی اور احترامی جملے لکھے ہوئے پائے۔ اسی طرح جب کوئی عالمِ دین یا آپ کے کوئی شاگرد درسگاہ میں حاضر ہوتے، تو آپؒ فوراً مسند خالی کر کے جگہ دیتے اور اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرتے، شاگرد تو منع کرتے؛ مگر باہر سے آنے والے مہمان علما آپ کے اصرار کی وجہ سے بیٹھ جاتے۔

ایک واقعہ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت استاذِ محترم سبق سے فارغ ہوئے، اسی وقت جامعہ کے خادم (وائر مین) صدیق بھائی کسی غرض سے آپ کے پاس تشریف لائے، آپؒ نے خوب آؤ بھگت کی اور خوشی کا اظہار فرمایا، اور قدرے گفتگو کے بعد ایک طالبِ علم کو بلایا، اور اسے حکم دیا کہ چائے لے آؤ، جلدی کرنا اور اچھی لے آنا! طالبِ علم استاذِ محترم کی بات کو برابر سمجھ نہ سکا، اور نہ دوبارہ پوچھنے کی ہمت کرسکا کہ کہاں سے لاؤں، آخر قیاس کے گھوڑے دوڑا دیے، پھر کیا ہوا؟ جو نہ ہونا تھا وہ ہوا۔ یعنی طالبِ علم دفتر میں چائے لینے کے لیے چلا گیا، ذرا سوچئے! ایک قدیم استاذ جو تقریباً ۵۴ رسال سے مدرسہ میں خدمت انجام دے رہے تھے، جن کی خاص صفت یہ تھی کہ اس لمبی مدت میں دفترِ اہتمام میں اپنی نجی ضرورت کی خاطر کبھی دستِ سوال دراز نہ کیے، اس نادان طالبِ علم کی حرکت نے دفتر کے خادم کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مولانا نے اتنے سالوں میں پہلی مرتبہ اچانک چائے منگوائی، کیا بات ہے؟ حالانکہ اس طالبِ علم کو استاذِ محترم نے جامعہ سے متصل ہوٹل سے چائے لانے کے لیے کہا تھا، وہ نادان خطا کر گیا، اور دفتر میں حنیف بھائی سے کہہ دیا کہ مولانا رشید احمد کیات صاحب نے کہا ہے کہ دو بہترین چائے بنا کر دو۔ حنیف بھائی بھی تعجب کرنے لگے، لیکن حکم استاذِ محترم کا تھا، منع کیسے کر سکتے تھے؟ آخر کار اس طالبِ علم کو یوں کہہ کر درسگاہ میں واپس بھیج دیا کہ ابھی دودھ نہیں ہے،

میں دوکان سے دودھ لے آتا ہوں، اور چائے تیار کر کے حاضرِ خدمت ہوتا ہوں، مولانا سے کہنا تھوڑی دیر انتظار کریں۔

ادھر تو انتظار میں کئی گھڑیاں گذر چکی تھیں، استاذِ محترم دو چار طلبہ کو بھیج کر خبر بھی معلوم کر چکے تھے، ہر ایک مدرسہ کی ہوٹل میں جاتا اور مایوس واپس آتا، استاذِ محترم بار بار کہہ رہے تھے: چائے لینے کہاں چلا گیا؟ صدیق بھائی کو بھی دیر ہو رہی ہے۔ صدیق بھائی جانے کی اجازت طلب کر ہی رہے تھے کہ اچانک وہ طالبِ علم خالی ہاتھ درسگاہ میں داخل ہوا، استاذِ محترم پر خفگی کے آثار طاری ہو گئے، دریافت کیا: بھائی! خالی ہاتھ کیوں آ گئے؟ طالبِ علم کو کیا پتہ تھا کہ میری اس حرکت پر قیامت برپا ہو جائے گی، وہ جواب دیتے ہوئے کہنے لگا: استاد جی! حنیف بھائی نے کہا کہ ابھی دودھ نہیں ہے، گاؤں سے دودھ لے کر آتا ہوں اور چائے بنا کر دے جاتا ہوں، آپ تھوڑی دیر انتظار کریں۔ اس بات کا سننا تھا کہ استاذ محترم کی بے چینی بڑھ گئی، اور آپ کفِ افسوس ملتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: تو سیڑھی سے اتر کر کیوں گیا؟ اوپر سے ہی کود جاتا، پھر کہنے لگے: خود بھی پریشان ہوا، اور ہمیں بھی پریشانی میں ڈال دیا، چل بیٹھ جا! بالکل ''موالی'' معلوم ہوتا ہے۔ غم وغصہ کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ اس واقعہ سے آپ کو بڑی ٹھیس پہنچی؛ لیکن آخر کیا کرتے جو ہوا سو ہوا، کہنے لگے: صدیق بھائی! میں نے اتنے سالوں میں کبھی مدرسہ کی چائے نہیں منگوائی، آج اس نے سب پانی پھیر دیا۔

قارئین! ذرا ظرف تو دیکھئے: اتنا سب کچھ ہونے کے بعد کہتے ہیں: صدیق بھائی! بچہ بہت ہوشیار ہے، لیکن مَثل مشہور ہے ''بچے عقل کے کچے ہوتے ہیں، چلو کوئی بات نہیں''۔ پھر حنیف بھائی ہاتھ میں طشت لیے ہوئے جس پر دو خوبصورت کپ گرم ذائقے دار چائے کے بھرے ہوئے تھے لے کر آئے، اور اپنے مخصوص لہجہ میں سلام عرض کیا۔ استاذِ محترم نے جامعہ کے اس خادم سے بڑی معذرت کی، اور کہا: خواہ مخواہ آپ کو تکلیف ہوگئی، پھر پورا واقعہ سنایا۔ اس قصے سے جہاں خدام وزیر دست کے ساتھ آپ کے حسنِ سلوک اور عفو ودرگذر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہیں استغنا و بے نیازی اور جامعہ کے مال میں احتیاط کا پہلو بھی دیکھا جاسکتا ہے، کون ہے آج جس کو ادارے کا کام کرتے ہوئے سالہا سال گذر گئے ہوں اور اس نے ادارے سے ایک چائے کی پیالی بھی نہ پی ہو؟۔

آپ خطوط کے آئینہ میں

آپ نے جب بھی اپنے قلم کو جنبش دی، وہ قلم انشا پردازی کے گُل بوٹے بکھیرتا رہا، ادب کے موتی لٹاتا رہا، اور الفاظ وتعبیرات کے تاج محل بناتا رہا، آپؒ کے تحریری خط میں ایسی دل آویزی ہوتی کہ قاری پورا مضمون پڑھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا، آپ کی تحریر کی سب سے عمدہ خوبی یہ تھی کہ وہ آسان الفاظ، خوبصورت تعبیرات، چھوٹے چھوٹے جملے اور عمدہ چٹکلوں سے لبریز ہوتی، جس میں اشارے وکنائے کا برمحل استعمال، اور موزوں اشعار سے تانے بانے جڑے

ہوتے، اندازِ تحریر نہایت ظرافت آمیز جو ہر کسی کو ہنسنے یا کم از کم مسکرانے پر آمادہ کردیتا۔ آپ کی ایک خصوصیت یہ دیکھی گئی کہ آپ متعلقین سے اکثر اوقات قلمی رابطہ فرمایا کرتے تھے، یعنی جو بھی بات پیش آتی عموماً سلیٹ یا کاپی پر شگفتہ تحریری انداز میں لکھ کر کچھ اس طرح اظہارِ خیال فرماتے کہ آپ کا مافی الضمیر ہمارے سامنے عمدہ پہلو لے کر نمودار ہوجاتا، اگر میں یوں کہوں کہ ان کی تحریر ''سمندر بہ کوزے'' کا مصداق ہوتی تھی تو مبالغہ نہ ہوگا۔

علمائے ادب کا قول ہے کہ انشا پردازی میں مقدس سنجیدگی بھی شیریں دیوانگی کا لبادہ اوڑھے سامنے آتی ہے۔ اگر یہ بات واقعی سچ ہے تو استاذِ محترم کی تحریر اس کی عمدہ مثالوں میں سے ایک ہے، آپ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے تحریر کا بڑا شوق تھا، اس لیے بہ کثرت متعلقین کو چاہے اساتذہ ہوں یا تلامذہ، یا کوئی عامی شخص، ہر ایک کو خطوط کے ذریعہ محبت کا گلدستہ پیش کرتے۔

ذیل میں چند خطوط نقل کیے جاتے ہیں جو ان شاء اللہ طالبانِ علومِ نبوت کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

درجِ ذیل خط اپنے ایک شاگرد کے نام ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ڈابھیل :396415 بتاریخ ۸ / فروری ۲۰۱۳ء

بخدمتِ گرامی محترم المقام جناب نورِ نظر محمد زید سورتی سلمہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ کا مزاجِ گرامی بخیر ہو، بعد سلام مسنون!

عرض یہ ہے کہ مکان کے پہلے منزلے پر رات کی تنہائی میں ''معارفِ مثنوی'' پڑھ رہا تھا، اس میں ایک حکایت نگاہ سے گذری، واللہ پاکیزہ محبت کے متعلق قلم کا عجیب جادو جاری کیا تھا، جس کے پیشِ نظر چند تأثرات بذریعۂ خط سپردِ ڈاک کرکے آپ کی خدمت میں حاضر کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں، امید ہے کہ ان شاء اللہ شافی جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔ خیر! محترم قبلہ والد صاحب اور مکان میں بھی تمام چھوٹوں، بڑوں کو تحفۂ سلام پیش کرنا، رات کے جو وظائف بتائے گئے تھے، وہ از اول تا آخر بلا ناغہ ادا فرماتے رہیں۔

دل سے جو دعا نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پر نہیں؛ طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

خط کا جواب مطلوب ہے، دعا میں فراموش نہ فرماویں۔

فقط والسلام

دعا گو: رشید احمد عفی عنہ

ذیل میں مذکور خط آپ کے ایک شاگرد کی نانی اماں کی بیمار پرسی کے لیے لکھا گیا تھا۔

بخدمت گرامی محترم المقام جناب حاجی محمد یوسف صاحب سورتی اور

مکان میں تمام چھوٹے بڑے حضرات!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے آپ کے مزاجِ گرامی بخیر ہوں۔

بعد سلام مسنون! گزارش اینکہ، گزشتہ رات ٹیلی فون کے ذریعہ واجب الاحترام آپ کے قبلہ ومحترم امّاں جان کا جو نازک حادثہ پیش آیا، معلوم ہوا، بشری فطرت کے مطابق ہم تمام گھر والوں کو واقعی بہت صدمہ لاحق ہوا، کیا کیا سوچا تھا، اور کیا ماجرا پیش آیا، حالانکہ عزیزم زید اپنے دوست صابر بھائی کے ساتھ خوشی درخوشی بابرکت ضیافت کی مبارک دعوت پیش کرنے کے لیے ہمارے اپنے ہی مکان موضع ڈابھیل تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس درمیان اچانک مذکورہ سانحہ کا واقع ہونا دل ودماغ کے اندر بھی شامل نہ تھا، حق تو یہ ہے کہ بشر کیا کیا سوچتا ہے اور قدرتِ کاملہ کیا کرشمہ دکھاتی ہے، جس کا جوڑ ہماری سوچ سے بالکل ہی بالاتر ہے۔ بقول شاعر

خوشی کے ساتھ دنیا میں ہزاروں غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتی ہیں شہنائیاں وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

حاجی صاحب! آپ خفگی نہ فرمائیں، بس وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، جس پر ہم سب ایمانداروں کا ایمان ہے، خط کا ماحصل مدّعا یہی ہے کہ حکمِ ربی ونوشتۂ مقدّر تسلیم ہے۔ آپ کے گھر کی ضیافت جب منظورِ خدا ہوگی تب ہی آپ

کی مہمان نوازی کی شاندار کامیابیاں قدم چوم لیں گی۔

بہر کیف! پیارے بھائی جان محمد یوسف صاحب! آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ آپ بالکل ہی رنج وغم نہ کریں، بلکہ آپ کا خوش وخرّم رہنا، میرے لیے عین مسرت کا پیغام ہے۔جس پر خدا گواہ ہے، پیارے بھائی یوسف صاحب اور مجھ کو، ہماری والدہ کی یاد خوب رلاتی ہے، اوپر سے تو خاموش رہتے ہیں؛ مگر کلیجہ کی بات دل ہی جانتا ہے۔ بقول شاعر

گری شبنم پتی پر؛ مگر پتی نم نہیں ہوتی		جدائی لاکھ ہو؛ مگر محبت کم نہیں ہوتی

میری ماں! دستہ بستہ ہم آپ کے دو بیٹے دونوں بھائی: یوسف ثانی، اور رشید احمد معافی کے خواستگار ہیں، کاش کہ آپ درگذر فرمادیں تو ہماری بڑی سعادت ہوگی۔

دعا گوں ہوں کہ آپ بلا تاخیر صحت یاب ہوں، اس کے بعد ضیافت میں ہم سب مل کر آجائیں گے، انشاء اللہ۔ کھانا کھا کر خدا تعالیٰ کی بے اندازہ شکر گزاری کریں گے، دریں چہ شک۔

اماں جان! آپ شفا خانہ میں صاحبِ فراش ہیں، اور راقم الحروف اپنے پرانے اصول کے مطابق موضع بروڈہ روانگی کی تیاری میں ہے۔آپ کے بیٹے زید بھائی بھی آئے تھے، آپ کی پاکیزہ محبت کی وجہ سے آپ کے دیدار کی تمنائیں دل ودماغ میں جاگزیں تھی، مگر خیر، اماں جان! پیارے بیٹے زید میرا خط

پڑھ کر سنا دیں، تو آپ زار وقطار بالکل نہ روئیں، اس کے عوض دعا فرما دیں کہ خدا تعالیٰ یوسف اور رشید احمد کو دین دار بنا دیں، آمین۔ اپنی حقیقی ماں کے سائے سے محروم ہوجانے کی وجہ سے ماں کی مامتا کے لیے ترس رہا ہوں، کیونکہ ماں کے پاؤں تلے جنت اور باپ جنت کا خاص دروازہ ہے۔

میرے آنے سے پہلے آپ اپنے بیٹے زید بھائی کے پاس تشفی نامہ لکھوا کر میرے پتہ پر ارسال کرنے کی زحمت گوارا فرماویں تو آپ کا جان و دل سے بہت بہت شکریہ۔ فقط والسلام

دعا گو دعا خواہ

رشید احمد عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمتِ گرامی محترم المقام جناب حاجی انصاری محمد مُصطفیٰ محمد یوسف صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا کرے کہ آپ کے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

بعد سلام مسنون گزارش اینکہ:

عزیزم! نورِ چشم عبد الملک سلّمہٗ کی شادی مبارک کا رجسٹرڈ اے، ڈی، کے ذریعہ دعوت نامہ بلا تاخیر برابر وقت پر پہنچا، واقعی! جس کو بار بار پڑھ کر

خوشیوں کا پیمانہ چھلک گیا، شکریہ! آئندہ کے لیے یہی امید قوی وابستہ!
یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ.....

خیر! جواباً عرض یہ کہ اگر طبیعت قرینے سے رہی تو ان شاء اللہ! آپ کی پاکیزہ محبت کے جذبات کی قدردانی کرتے ہوئے دو چار روز قبل ہی اپنی آمد کی اطلاع دے کر پیارے بیٹے عمردراز سرفراز عبدالملک سلّمہ کی شادی خانہ آبادی میں شرکت کرنے کی البتہ کامل ترین سعی کروں گا، دعا فرماویں خدا تعالیٰ آپ لوگوں کی بابرکت ملاقات کا ذریعہ پیدا فرماویں، اور پرانی تمناؤں کی تکمیل فرماویں، آمین۔

اَماں بھائی جان! یہ مُسلّم الثبوت حقیقت ہے کہ موقع ومحل کے پیشِ نظر باہم ملاقات ہوجایا کرتی ہے، باقی آج کل وقت کی قلّت کے باعث اپنے عزیزوں واقارب کی دعوت پر لبّیک کہا جائے، قابلِ غور بات ہے۔

بس! آپ دل جمعی کے ساتھ دعا کریں کہ: خدا تعالیٰ اپنے مقاصدِ حسنہ میں کامیابیاں بخش کر شادی کے تمام ضروری کاموں میں فلاحِ دارین سے معمور فرمائے، آمین۔

آپ کا دعوت نامہ موصول ہونے کے بعد یہاں سے بتاریخ: ۸/ستمبر ۲۰۰۵ء نورِ نظر پیارے بیٹے عبدالملک سلّمہ کے نام شادی کی مبارک بادی کا ٹیلی گرام ارسال کر چکا تھا، جو ان شاء اللہ آپ لوگوں کو موصول ہو چکا ہوگا، جس سے بشری فطرت کے مطابق آپ تمام کی مسرتوں میں اضافہ ہونا کھلی حقیقت ہے، جس

کی تشریح ان شاء اللہ آئندہ خطوط سے معلوم ہوگی۔

محترم بھائی جان! شادی خانہ آبادی کے مسرت بھرے لمحات کے پیشِ نظر کل چار کتابیں عزیزم نورِنظر عبداللہ فیصل کے ہمراہ ہدیہ کے طور پر حاضرِ خدمت کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں، جو پڑھ لینے کے بعد شافی جوابات تحریر فرماویں تو میرے دل کو خوشی ہوگی۔

چاروں کتابوں کی تشریح مذکور ہیں:

(۱) تحفۂ دولہا، بیٹے عبدالملک کے لیے۔

(۲) اُن کی اہلیہ محترمہ کے لیے تحفۂ دلہن۔

(۳) الحزب الاعظم، آپ جناب کے لیے۔

(۴) افضل الوظائف: امِّ عبداللہ فیصل کے لیے۔

(۵) خطوط۔

حاصل یہ کہ کل پانچ اشیاء حاضرِ خدمت کرنے کا شرف حاصل کررہا ہوں، جو موصول ہوجانے پر ٹیلی فون کے ذریعہ بعد العشاء مطلع فرمانے کی زحمت گوارا فرماویں تو بڑی ہی کرم نوازی ہوگی۔

اماں! عشا کے بعد کی تاکید اس بنا پر کررہا ہوں کہ دن کے اوقات میں ملحقہ مکاتب کے امتحان کے لیے جانے کی وجہ سے مکان پر موجود ہونا مشکل مرحلہ ہے، رات کے اوقات میں بہر کیف! مکان پر آجایا کرتا ہوں، تا کہ دور

افتادہ بھائی جان کے ساتھ قرینہ سے گفتگو کا موقعہ ہاتھ لگ جائے تو شکرِ خدا، جس پر توجہ مبذول فرماویں تو جانبین کے لیے اَحْسَنُ صورت ہوگی۔

عبداللہ سلّمہ بھی کافی اصرار کرتے رہتے ہیں؛ لیکن طویل سفر کی معذوری کی دیوار حائل ہونے کے نتیجہ میں دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے، پَر ہونے نہیں پاتی:

گری شبنم پتی پر مگر پتی نَم نہیں ہوئی		جدائی لاکھ ہو مگر محبت کم نہیں ہوتی

خیر مصلحت خدا کی، نوشتۂ مقدّر، بقولِ شاعر:

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

رمضان شریف کے پہلے عشرہ میں وہی پرانی ٹکٹوں کے ساتھ ساتھ کم وبیش کرتے ہوئے عمرہ کے لیے حتی الامکان کوشش کر رہا ہوں، دعا فرماویں کہ خدا تعالیٰ خیر کا فیصلہ فرما کر ہمیں مقبول عمرہ نصیب فرما کر دارین کی ترقیوں سے نوازے، آمین، پرسانِ حال کو تحفۂ سلام۔ رشید احمد عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمتِ گرامی محترم المقام جناب حاجی انصاری محمد مصطفیٰ بن محمد یوسف صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ آپ کے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

بعد سلام مسنون! عرض اینکہ نورِ چشم فرزند عبداللہ فیصل سلّمہٗ کی وساطت سے مکتوبات اور کتابوں کا پارسل بھی ان شاء اللہ آپ کو بروقت موصول ہو چکا ہوگا، جس کو پڑھ کر کاشفِ احوال ہونا اظہر من الشّمس ہے۔

مولانا عبد الرحمٰن سلّمہٗ بفضلِ خدا مالیگاؤں سے یہاں پر بحمد اللہ بخیر وعافیت تشریف لا چکے ہیں جو فقط اطلاعاً عرض ہے۔

دراصل اُن کی زبانی نورِ نظر پیارے فرزند عبد الملک سلّمہٗ کی شادی خانہ آبادی کی خوش خبریاں از اول تا آخر گوش گزار ہوئی، واقعی جس کو سن کر خوشیوں کا پیمانہ چھلک گیا، جس کے نتیجہ میں ہم تمام خداوند تعالیٰ کے بے حد شکر گزار ہیں۔

دعا کرتا ہوں کہ زوجین میں بے لوث پاکیزہ محبت کا اضافہ فرما کر ازدواجی زندگانی کو از اول تا آخر، خیر وبرکت سے بھرپور فرما کر مقاصدِ حسنہ میں کامیابیاں بخش کر ہر دم فلاحِ دارین سے معمور فرماویں، آمین ثم آمین یارب العالمین۔

محترم! اب ضمیر یہ سوال کرتا ہے کہ: بھیجی ہوئی تمام کتابوں کے مطالعہ کرنے کے بعد بالکلیہ آپ لوگوں کو پسند آئی یا نہیں؟ اماں! جس کی تشریح قلمبند فرمانے کی زحمت گوارا فرمائے تو راقم السطور کے بے قرار دل کو یک گونہ تشفی ہوگی۔

جنابِ من! شادی کی مبارک بادی کے لیے فرزند عبد الملک سلّمہٗ کے نام ارجنٹ ٹیلی گرام سپردِ ڈاک کر چکا تھا، جس سے آپ لوگوں کی مسرتوں میں اضافہ ہونا بشری فطرت پر مبنی ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ خطوط سے معلوم ہونا

ممکن الحصول ہے، خیر!

بھائی جان! سچ تو یہ ہے کہ روزانہ کی ہفتہ واری دعاؤں کے ذخیرہ کے لیے راقم الحروف نے ''الحزب الاعظم'' کو ترجیح دے کر انتخاب کرتے ہوئے خصوصاً آپ ہی کی ترغیب کے لیے دی ہے، جس پر توجہ مبذول فرما کر دنیا اور آخرت کی شاندار کامیابی حاصل کریں۔

برادرم! فجر کی نماز کے بعد گھر آکر پہلی فرصت میں بلا ناغہ کتاب میں لکھے ہوئے ایام کے مطابق دل جمعی کے ساتھ پڑھنے کا اپنا معمول بنالیویں، اس کے بعد ناشتہ سے فارغ ہوکر دوکان پہنچ کر بسم اللہ پڑھیں اور یٰسین شریف کا ورد ہمیشہ جاری رکھے، ان شاء اللہ، اس کی برکت سے تنگی کا کبھی بھی سامنا نہ ہوگا، اور دائماً پورا خاندان خوش حال رہے گا۔

ذرا سنو تو! دنیا تو بے وفا اور مطلق فانی ہے، ہمارا ایمان وعمل یہ ہے کہ ہم تو پروردگار عالَم سے اپنا ذاتی سوال حَل کریں گے، بس! زندگانی کے تمام اہم کاموں کے لیے وہی پاک ذات کافی اور وافی ہے۔

رزق خود اُڑ اُڑکر پہنچتا ہے جو ہے مقدر کا
پَردے دیے ہیں میرے رزّاق نے ہر ہر دانے کو

نورِ چشم! عزیزم فرزند عبد اللہ فیصل سلّمہٗ سے گزارش کریں کہ والدین کی اطاعت ہی فلاحِ دارین کی بے مثال کنجی ہے۔

اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی جنت کی چابی ہے۔

اور تلاوتِ قرآن بزرگانِ دین کا انمول شیوہ ہے۔

جس پر ثابت قدم رہنے سے دونوں جہاں کی ترقیوں کا خزانہ حاصل ہوتا ہے۔

بشرطِ سہولت فرزند کو میری تحریر پڑھنے کے لیے دیویں، اور تحفۂ سلام کے ساتھ پیشگی میں عید الفطر کی مبارک بادی پیش کریں، اور عبداللہ فیصل اور عبدالملک دونوں بھائیوں کو خط وکتابت کرنے کی گزارش کریں، تاکہ محبت میں اضافہ ہوتا جائے۔

بھائی جان! اخیر میں میری جانب سے محض گزارش یہ ہے کہ آپ ''معارفِ مثنوی'' کا مطالعہ جاری فرماویں، ان شاء اللہ بے اندازہ فائدہ ہوگا۔

اندازِ بیان ایسا دل پذیر ہے کہ پہلے واقعہ بیان کرتے ہیں، اور اُس میں عبرت آموز پند ونصیح پر روشنی ڈالتے ہیں، اور اُس پر توجہ مبذول کرنے سے تقویٰ کو تقویت حاصل ہونے میں کوئی کلام کی گنجائش نہیں، بہرکیف! مفید وکارگر کتاب ہے۔

ماہِ رمضان شریف کی بابرکت گھڑیوں میں احقر کو دعا میں فراموش نہ فرماویں۔

مکان میں تمام افراد کو تحفۂ سلام کے ساتھ ایڈوانس میں عید الفطر کے بابرکت موقعہ پر فرداً فرداً ہر ایک کو خوب خوب عید مبارک، ننھے منوں کو اَن گنت پیار۔

فقط والسلام، خدا حافظ، رمضان المبارک کے بعد عید مبارک۔

رہی زندگی تو ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔

دعا گو ودعا خواہ: رشید احمد عفی عنہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت گرامی محترم المقام جناب انصاری محمد مصطفیٰ صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے کہ آپ کے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔

بعد سلام مسنون گذارش اینکہ: آپ کا ارسال فرمودہ پاکیزہ محبت سے بھرا ہوا عنایت نامہ موصول ہوا، واقعی جس کو پڑھ کر خوشیوں کا پیمانہ چھلک گیا، شکریہ، آئندہ کے لیے یہی امیدِ واثق وابستہ۔

یاد آوری کا بہت بہت شکریہ

نیز عزیز القدر عبد اللہ فیصل سلّمہٗ کے ہمراہ حلوا اور چوڑا کا گراں قدر تحفہ بھی جو آپ نے ارسال فرمایا تھا وہ بھی بحمد اللہ بروقت برابر موصول ہو چکا ہے، جو فقط اطلاعاً عرض ہے، برائے نوازش قطعاً فکر وتشویش نہ فرماویں، لہٰذا تہہِ دل سے آپ کا بہت بہت شکر گذار ہوں۔

اماں! یہ کہ تحائف ارسال فرمانے کی زحمت گوارا نہ فرماویں، تو آپ کی کرم نوازی ہوگی، بار بار اچھا نہیں لگتا۔

محترم! اس کے عوض قلم وقرطاس کے حوالے سے نصف الملاقات کی سعادت بخشتے رہیں تو احسانِ عظیم گردانا جائے گا، برائے نوازش راقم الحروف کی جانب آئندہ کے لیے توجہ مبذول فرمایئے گا عنایت ہوگی۔

عزیزم! عبد اللہ فیصل سلّمہٗ بفضلِ خدا آپ لوگوں کی دعاؤں کی طفیل لکھائی پڑھائی میں ہمہ تن مشغول ہے، دعا فرماتے رہیں کہ: خدا تعالیٰ اُن کی محنتِ شاقّہ کو شرفِ قبولیت سے نواز کر اس کا نعم البدل عطا فرما کر ہر ایک ماہانہ، سہ ماہی، شش ماہی، سالانہ امتحانوں میں ممتاز شاندار کامیابیوں سے مالا مال فرما کر دین کا داعی اور عالم باعمل پیدا فرما کر دارین کی ترقیوں سے مالا مال فرماویں، آمین

عزیزم عبد اللہ فیصل باخیریت رہتے ہوئے صحت یاب ہے، کوئی فکر وتشویش نہ فرماویں، ان کی تعلیم وتربیت کے لیے ہمیشہ دعا فرماتے رہیں:

دل سے جو دعا نکلتی ہے اثر رکھتی ہے		پر تو نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

ششماہی امتحان کی تعطیلات کے درمیان آپ کی دعوت پر لبیک کہنے کی سعی کروں گا، دعا فرماتے رہیں کہ خدا تعالیٰ ملاقات کا ذریعہ پیدا فرمائے، آمین۔

کاش کہ آپ لوگ بھی ہمارے غریب خانہ پر مہمان بن کر تشریف آوری کی زحمت گوارا فرمائے تو زہے قسمت۔

جنابِ من! تشریف آوری سے پیشتر مطلع فرمایئے گا، تاکہ باہم ملاقات میں سہولت شاملِ حال رہے، اور جانبین کے لیے روحانی سکون قائم رہیں۔

مکان میں تمام کو سلام محبت اور ننھے مُنّوں کو اَنْ گِنت پیار۔ خط کا جواب مطلوب ہے، دعا میں فراموش نہ فرماویں۔ فقط والسلام مع الاحترام

دعا گو دعا خواہ: رشید احمد عفی عنہ

ذیل میں آپ کے نام آپ کے استاذِ محترم مولانا شریف صاحب دیوبندی کی جانب سے خط کا جواب مذکور ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استاذِ محترم اپنے اکابر اساتذہ کے ساتھ خطوط سے استفادہ کے اتنا پختہ رشتے استوار کیے ہوئے تھے کہ خط نہ آنے پر اکابر اس کو مستقل محسوس فرماتے تھے، ملاحظہ کیجیے۔

باسمہ تعالیٰ

محمد شریف حسن دیوبندی

عزیز القدر مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لفافہ موصول ہوکر کاشفِ احوال ہوا، یادآوری کا شکریہ، کوئی مضائقہ نہیں تاخیرِ جواب میں، جب کہ آپ کو بمبئی کا سفر درپیش ہوا، تو وقت اس میں کافی ختم ہوا، یہ آپ کی سمجھداری ہے کہ آپ کو اس کا احساس ہے، میرا دل بہت خوش ہوا، قادرومختار آپ کو اپنے مقصد میں جلد از جلد کامیاب فرمائیں، آمین۔

آپ نے جو کتاب ''راہِ سنت'' کے تعلق سے فرمایا تھا کہ مکتبۂ تجلی نے اس کو نہیں بھیجا، بندہ نے فوراً ان کے یہاں کہلا بھیجا، اور افسوس کا اظہار کیا، کہ اب تک کتاب روانہ نہیں کی، کیا ہوا؟ انہوں نے اس کے جواب میں اسی دن کتاب روانہ کردی، جو آپ کو مل گئی ہوگی، ان کو ان کی بھول اور غلطی کا احساس بھی ہوا، خیر! بات ختم ہوئی۔ میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کی نصرت سے مالا مال

فرمائیں، آمین۔ دارالعلوم میں ۴؍ذی قعدہ کو اسباق شروع ہو گئے۔ فقط والسلام

محمد شریف حسین دیوبندی

محلہ کدپورہ اونچا، دیوبند

تلامذہ کا آپ سے تعلق

آپ کی خطوط نویسی اور آپ کی شفقتیں طلبہ پر اس قدر اثر انداز ہوتیں کہ جامعہ سے جانے کے بعد بھی تلامذہ بذریعۂ ڈاک آپ سے رابطہ میں رہتے اور خطوط کے ذریعہ آپ کی ذات سے استفادہ کرتے، اگر خط لکھنے میں کوتاہی ہوتی یا تاخیر ہو جاتی تو شاگرد شرمندہ ہوتا اور اس غفلت پر معذرت خواہ، ذیل کے دو خطوط سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو سعادت مند شاگردوں نے اپنے شفیق استاذ کے نام تحریر کیے ہیں۔

محترم المقام جناب استاذی مولانا رشید صاحب دامت برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون! عرض اینکہ بندہ بہ خیر وعافیت ہے، امید ہے کہ آنجناب مع اہل وعیال کے بہ خیر ہوں گے۔

بعدہٗ عرض اینکہ کافی عرصہ گذر چکا کہ آنجناب سے ملاقات نہیں ہوئی، امید ہے کہ اس کو قلّتِ محبت پر محمول نہیں کیا جائے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بار بار آنجناب کا خیال آتا ہے، نہ تو محبت میں کمی ہوگئی اور نہ تو یہ بات ہے کہ آنجناب

فراموش کیے گئے، ایسے شخص کو۔جس کا اتنا بڑا احسان ہو۔کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز ممکن نہیں، البتہ مذکورہ باتوں کو سستی پر محمول کیا جا سکتا ہے، بہر حال امید ہے کہ اس بڑی کوتاہی کو معاف کریں گے۔

دیگر احوال الحمدللہ سب بہ خیر ہیں، امسال بندہ نے شرحِ وقایہ میں داخلہ لیا ہے، اور مندرجۂ ذیل کتابیں داخلِ درس ہیں:

(۱)شرح الوقایہ (۲)نور الانوار (۳)ترجمۂ قرآن پاک (نصف اول) (۴)مختارات (۵)شرح شذور الذہب (۶)تلخیص المفتاح (۷)ریاض الصالحین (نصف ثانی)۔

اس کے علاوہ بندہ نے ''سبعہ'' شروع کیا ہے، امید ہے کہ آنجناب کامیابی کے لیے ضرور دعا کریں گے۔

حافظ محمد ڈیسائی افریقہ نے آنجناب کا پیغام پہنچایا تھا، واقعتاً اس سے بڑی شرمندگی ہوئی۔

آنجناب کی تعلیم بہت یاد آتی ہے، آنجناب نے اس ناکارہ کے پیچھے بہت زیادہ محنت کی، اللہ تعالیٰ آنجناب کو اپنی شایانِ شان بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

اگر آنجناب نے اتنی محنت نہ کی ہوتی تو اس درجہ کو نہ پہنچے ہوئے ہوتے، یہ محض آپ کی محنت کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ پورا پورا بدلہ عطا فرمائے، آمین۔

مجھے نہ لکھنا نہ پڑھنا آتا ہے، اس کے باوجود استاذِ مکرم آپ کو لکھ رہا ہوں،

یہ بات یقینی ہے کہ اس خط میں کافی غلطیاں ہیں، امید ہے کہ قلمِ عفو پھیر دیا جاوے گا۔

مکان سے خطوط ملتے رہتے ہیں، الحمدللہ! سب بہ خیر ہیں۔ آج ہی بندہ کے بہنوئی (مولانا عثمان) کا خط موصول ہوا، اس میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ والدہ کچھ ایام ہسپتال (Hospital) میں رہی تھیں، لیکن اب الحمدللہ! طبیعت ٹھیک ہے، امید ہے کہ ان کی صحت کے لیے دعا کی جاوے گی۔

اور تو کیا لکھوں؟ زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ اگر کوئی بات لکھ دی گئی اور وہ نامناسب ہو تو گستاخی ہوگی، لہذا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے اس خط کو مکمل کرتے ہوئے اخیر میں آنجناب سے دعا کی درخواست کروں گا۔

اگر آنجناب کی شان کے خلاف کوئی بات لکھی گئی یا کوئی الفاظ استعمال کیے گئے ہو تو امیدِ قوی ہے کہ بندہ کو معاف کیا جائے گا۔

امید ہے کہ اپنی ادعیۂ صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں گے۔

آنجناب کا شاگرد

محمد اسماعیل شبیر احمد ابراہیم دیسائی

فقط والسلام

آنجناب کے پتے کا علم نہیں تھا، اسی وجہ سے مولانا عبدالصمد کے نام اس خط کو روانہ کیا۔

باسمہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مشفقی ومکرّمی حضرت مولانا دامت برکاتہم العالیہ!

بعد سلام! عرض اینکہ بندہ محمد ابن الیاس لندنی متعلم مظاہرِ علوم دار جدید جس نے چند سال جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تعلیم حاصل کی، اور حضرتِ والا سے عربی اول کی تعلیم حاصل کی، اور آپ کی شفقت اور محبت کا خوب مظاہرہ ہوا جس کا احسان ان شاء اللہ تا حیات یاد رہے گا۔ جزاکم اللہ خیرا

کئی دنوں سے یہ خواہش دل میں مچل رہی تھی کہ آنجناب سے خط وکتابت کے ذریعہ رابطہ کروں، لیکن اولاً تعلیم کی مشغولیات اور دیگر اپنی سستی وکاہلی مانع رہی۔ اس احسان فراموشی پر عمیقِ قلب سے معذرت خواہ ہوں، فی الحال بندہ دورۂ حدیث میں متعلّم ہے، مشکوٰۃ تک ہانسوٹ ہی میں تعلیم حاصل کی، اور آئندہ سال ترکیسر تخصص فی القراءت کے لیے جانا طے ہوا ہے، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ کامیابی عطا فرمائیں۔ اور اب فراغت ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ علم کے ساتھ عملِ صالح کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ کسی قسم کی بندہ سے ماضی میں گستاخی ہوئی ہو تو معاف فرمائیں، اور آپ کے ملفوظاتِ عالیہ سے مستفید فرمائیں۔ کارِ لائقہ سے یاد فرما کر ممنون فرمائیں، جزاکم اللہ خیرا

والسلام مع الاحترام

طالبِ دعا: محمد لندنی ۷/۷/۱۴۲۱ھ

خطوط نویسی کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: آپ کو خطوط لکھنے کا بہت ذوق تھا، بسا اوقات بعض اشخاص کو سال بھر میں تقریباً پچاس خطوط روانہ کرتے، اردو گجراتی بہت اچھا لکھتے تھے جس میں بہت ہی عمدہ تعبیرات استعمال کرتے تھے، کبھی کسی کا انتقال ہوتا تو خود اپنی جانب سے تعزیتی خط لکھتے، پھر میری جانب سے بھی لکھ دیتے، اخیر دنوں میں میرے پاس بھی سلیٹ پر کچھ نہ کچھ لکھ کر ضرور بھیجتے رہے''۔

دادی اماں کا بیان ہے کہ: ''علمی اعتبار سے آپ تہی دست نہ تھے، اسی وجہ سے آپ کے پاس خطوط لکھوانے اور پڑھوانے والے کثرت سے آیا کرتے تھے، آپ کبھی کسی کو منع نہیں کرتے تھے''۔

حضرت مولانا یوسف صاحب بھولا مدظلہ العالی رقم طراز ہیں کہ: استاذ محترم کا خط کبھی اردو میں تو کبھی گجراتی میں ہوتا، دونوں زبانوں کی فصاحت و بلاغت کے بکھرے موتیوں کے الفاظ پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی''۔

نیز اس سلسلے میں مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہ لکھتے ہیں کہ: استاذِ محترم صاحبِ قلم تھے، بہت سارے خطوط لکھا کرتے تھے اور بعض مرتبہ درسگاہ میں طلبہ کو وہ خطوط سناتے بھی تھے جس میں ادب کا ایک نیا انداز ہوتا۔

خطوط نویسی کے سلسلے میں استاذِ محترم مفتی عرفان احمد صاحب مدظلّہ رقم طراز ہیں کہ: آپ کی تحریر بہت عمدہ تھی، خوش نویس تھے، موٹے قلم کو پسند فرماتے

تھے، اور جب کوئی اہم خط تحریر فرماتے تو تمام طلبہ کو سنواتے اور عموماً اسے بآوازِ بلند پڑھنے کی سعادت راقم کو حاصل ہوتی، خط کی ابتدا ''باسمہ سبحانہٗ وتعالیٰ'' سے کرتے، اور پڑھواتے وقت بھی یہیں سے شروع کرواتے، پھر القاب، پھر خط کا مضمون اور اخیر میں تحریر کنندہ کا نام اور تاریخ سب پڑھواتے تھے، خط کے اختتام پر اپنا نامِ نامی اس طرح لکھتے: ''العبد رشید احمد کیات عفی عنہ'' اب لفظ ''عفی عنہ'' کو پڑھنے میں غلطی ہوتی تو دیگر طلبہ سے کہتے: آپ اس لفظ کو صحیح پڑھو، کوئی کچھ پڑھتا کوئی کچھ پڑھتا۔ پھر آپ صحیح تلفظ بتاتے اور بہت زور دے کر جھٹکے سے پڑھتے تھے، سننے والوں کو بڑا مزہ آتا تھا''۔

آپ صرف خطوط نویس نہ تھے؛ اپنے خُردوں کو خطوط نویسی کا ہنر بھی سکھاتے تھے، اور اس کے بہانے بہت سی چیزیں شاگردوں کے دل ودماغ میں اتار دیتے۔ حضرت مولانا اسماعیل صاحب نوساری زید مجدہ رقم طراز ہیں: ''خطوط نویسی آپ کا دل چسپ مشغلہ تھا، چناں چہ جامعہ کے شعبۂ مکاتب کے روحِ رواں آپ ہی تھے، اور اس سلسلہ میں جب متولیان یا اساتذہ کو خطوط روانہ فرماتے تو اس ناچیز کو بلا کر فرماتے کہ: پڑھ لو، خط کیسا ہے؟ اگر کسی تعزیت کا خط روانہ فرماتے تو مضمون پوری کلاس کے طلبہ کو پڑھ کر سُنواتے، اور پھر از راہِ شفقت دریافت فرماتے کہ: اہلِ خانہ کو تسلی ہوجائے گی یا نہیں؟ حتیٰ کہ لفافے پر پتہ کیسے لکھا جائے؟ کسی بڑے کے نام کے آگے لقب کیا لگایا جائے؟ کاغذ کیسے کاٹا جائے؟ لفافے پر گوند کیسے

لگایا جائے؟ فائل میں صفحات کیسے لگائے جائے؟ یہ تمام باتیں انتہائی شفقت کے ساتھ سکھاتے اور فرماتے کہ: آگے جاکر تمھیں بھی یہ سب کام کرنے ہیں''۔

اخلاص

استاذِ محترم انتہائی مخلص واقع ہوئے تھے، ہمیشہ آپ پر یہ فکر سوار ہوتی کہ یہ ٹوٹی پھوٹی محنت دربارِ الٰہی میں قبول ہوجائے، لہٰذا اس کے لیے بہت تگ ودَو کرتے رہے۔ ایک موقع سے شاگردوں کے سامنے بڑے اچھوتے انداز میں اخلاص کی حقیقت کو واضح فرمایا، کہنے لگے: ''اخلاص کا مقام باری تعالیٰ کے یہاں بہت زیادہ ہے، اس لیے کہ اخلاص پر عمل کا دارومدار رکھا گیا ہے، اگر اخلاص ہوگا تو اعمال کا ثواب ملے گا؛ ورنہ نہیں۔ پھر مثال دیتے ہوئے فرمانے لگے: اخلاص کا مل جانا گویا ایسا ہے جیسا کہ ایک آدمی نے بڑی مدتوں کے بعد ایک عمارت تیار کی ہو اور اخلاص کا ختم ہوجانا ایسا ہے جیسا کہ ایک آدمی نے تیار شدہ عمارت کو منہدم کردیا ہو؛ اس لیے ہمیشہ اخلاص کے ساتھ عمل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے''۔

حدیث شریف میں ہے: مخلصین ہدایت کے چراغ ہیں۔ ویسے تو آپ کی حیاتِ مبارکہ کا ہر وصف نمایاں تھا؛ لیکن اس میں دو وصف بہت ہی زیادہ نمایاں تھے: اخلاص اور تواضع، آپ کے اخلاص کو بھی اساتذہ کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''جامعہ کی ترقیات میں آپ کا بڑا کردار رہا ہے، ہر موقع پر آپ کا مطمحِ نظر ہر ایک کی نفع رسانی تھا اور

آپ یہ سارے کام بالکل اخلاص کے ساتھ کرتے تھے۔آپ نے جامعہ میں درس وتدریس کے علاوہ بہت سارے کام انجام دیے جن کا زندگی بھر معاوضہ تک نہ لیا‘‘۔

حضرت مفتی عباس بسم اللہ صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: ’’حضرت الاستاذ ’’معین المدرسین‘‘ کے رکن تھے، جگہ جگہ جاکر ہر ایک کی خبر لینا اوران کی حاجتوں کو پورا کرنا وغیرہ سارا کام آپ بلا معاوضہ کرتے تھے یعنی جامعہ کی طرف سے آپ کو کوئی باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی اور نہ آپ نے کبھی اس کا اظہار کیا؛ بلکہ اخلاص کے ساتھ تمام امور انجام دیتے رہے‘‘۔

وسعتِ قلب

آپ وسعتِ قلب جیسی نایاب صفت سے بھی نوازے گئے تھے، بڑا وسیع ظرف رکھتے تھے، جس میں ہر قسم کے اختلافات کے ساتھ تمام تر دینی جماعتوں اور تمام اہلِ حق کی گنجائش تھی، چھوٹے بڑے ہر ایک کے لیے اس کی صلاحیت کے مطابق الگ خانہ بنا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں حضرت قاری یوسف بھولا مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ: ’’ڈابھیل مرکز پر بہ روز جمعرات بندہ کا بیان طے ہوا، جب بیان ختم ہوا تو میری نظر استاذ پر پڑی، آپ ایک عوامی شخص کی طرح بڑی وسعتِ قلبی کے ساتھ پورا بیان سنتے رہے، حالانکہ میں ان کا شاگرد ہوں، اگر مجھے پہلے معلوم ہوجاتا کہ میرے استاذ بھی مجلس میں شریک ہیں تو میں انہیں اپنے قریب بٹھاتا اور ان کی مزید توجہات سے دل کے درد وسوز کو بکھیرتا‘‘۔

صبر وتحمّل

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جن مقاصد کی تکمیل کے خاطر ان حضرات کو مبعوث کیا گیا تھا ان کی تکمیل بغیر صبر وتحمل کے مشکل تھی، اس لیے ہر نبی نے بڑے صبر وتحمل سے کام لیا۔ خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو دیکھ لیجیے کس قدر مشقت آمیز تھی، آپ پر مکی اور مدنی زندگی میں کیسے کیسے عجیب وغریب حالات آئے، لیکن آپ ان تمام حالات میں صبر وتحمل اور استقامت کا مجسم نمونہ بنے رہے۔ استاذِ محترم نے بھی آخری لمحے تک جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو نمونہ بنائے رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ صبر وتحمل کی صفت بھی آپ میں پائی جاتی تھی۔ گذشتہ اوراق میں آپ پڑھ چکے کہ ابھی تو آٹھ سال کی عمر تھی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا، پھر ایک نا قابلِ برداشت مرحلہ بھائی کے انتقال کی شکل میں سامنے آیا، اور تعلیمی راہ میں نہ جانے کتنے دشوار کن مراحل سے گذرنا پڑا ہوگا، واللہ اعلم۔ غرض! ہر حال میں آپ خندہ پیشانی سے ان تمام کو برداشت کر کے صبر وتحمل کے پیکرِ مجسم بنے رہے۔

استقامت

آپ کی زندگی کا خاص جوہر اور آپ کی امتیازی صفت استقامت ہے، جس کی شہادت آپ کی پوری زندگی، آپ کے خطوط، آپ کی سادگی، آپ کی

تواضع وانکساری، آپ کی طویل خدمات، آپ کے کریمانہ اخلاق، آپ کا ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ، علما کا اکرام واحترام، امانت ودیانت داری، اخلاص وللّٰہیت اور وہ گونا گوں صفات جو آپ کی نظروں سے گذر گئیں، اور وہ حیاتِ مبارکہ جس کا آپ نے مطالعہ کیا، دیتی ہیں۔

ڈابھیل کیوں جگمگا رہا ہے

جامعہ ڈابھیل کے جگمگانے کا ایک بڑا راز یہاں کے ہر مدرّس ومعلّم کی استقامت ہے، استاذِ محترم اس چیز کے بہت قائل تھے، اگر ہمارے جدید فضلا بھی ان کے اساتذہ کی طرح استقامت سے کام لیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بعض مرتبہ فرماتے کہ: ’’میں تمھیں کہتا ہوں: جہاں کہیں جاؤ استقامت کا پہلو غالب رکھو، پہلے دن سے ترقیات نہیں ملا کرتی، جامعہ سے جاؤ، جہاں خدمت کا موقع میسر آ جائے وہاں پوری خوش دلی سے پڑاؤ ڈالو۔ وہاں کے ہر فرد کو اپنے سے مانوس کرو، اور اسے دین سکھاؤ، اور یہ چیز استقامت سے حاصل ہوتی ہے۔ دیکھو! ڈابھیل بھی پہلے ایک بنجر علاقہ تھا؛ لیکن ہمارے بڑوں نے استقامت سے کام لیا تو آج یہ ایسا چمنستاں بنا کہ اس کی خوشبو سے دنیا کا کونہ کونہ مہک رہا ہے۔ اسی لیے تو کہا گیا ”اَلا ستقامَۃ فوقَ الْکَرامۃ“، اس لیے جہاں جاؤ، وہاں استقامت کے ساتھ دین اور علمِ دین کی خدمت کرو، ایسے نہیں کہ ایک سال یہاں تو دوسرے سال وہاں، اس میں نہ تمھاری ترقی ہوگی اور نہ تمھارے پاس پڑھنے والوں کی ترقی ہوگی‘‘۔

قناعت پسندی

کسی کی دولت دیکھ کر حیران مت ہونا		خدا تجھے بھی دے گا پریشان مت ہونا

آپ نہایت قناعت پسند واقع ہوئے تھے، آپ کسی چیز سے کبھی مرعوب نہ ہوتے، اور نہ کسی کے مال وزر کو دیکھ کر متأثر ہوتے، بلکہ اوروں کو بھی قناعت سکھلاتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے: بندہ آپ کے سامنے آپ کی سائیکل لیے ہوئے کھڑا کسی کار کی جانب دیکھ رہا تھا، استاذِ محترم نے بڑے اچھوتے انداز میں مخاطب کر کے فرمایا: ''بیٹا شہزاد! دوسرے کا محل دیکھ کر اپنی جھونپڑی نہیں توڑنی چاہیے''۔ جامعہ کے استاذ مولانا رفیع الدین صاحب اونوی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''استاذ نہایت نیک تھے، سادگی کا تو پوچھنا ہی کیا، اور قناعت پسندی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی''۔

توکّل

توکّل کا یہ عالم تھا کہ والد ماجد کا انتقال ۸ ر سال کی عمر میں ہوگیا تھا، اور آئندہ پورے گھر کی ذمہ داری آپ پر تھی؛ مگر اس کے باوجود تعلیم کے حصول کے لیے کئی سال صَرف کیے، لیکن تعلیم ترک نہ کی، پھر جب نکاح ہوگیا، اولاد ہوئی، حالات نے بہت مجبور کیا، تدریس کے ساتھ دیگر ذریعۂ معاش پر بھی ابھارا، آپ نہایت خوش دلی سے اسے بھی کر گذرے؛ مگر اللہ کی رزّاقیت کا جو مضمون آپ کے دل میں گھر کر گیا تھا وہ کبھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوسکا، حالات کے ناموافق ہونے کے

باوجود اخیر زمانہ تک تدریسی سلسلہ سے جڑے رہے اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

رزق اڑ اڑ کے آتا ہے جو مقدر کا ہوتا ہے
پَر دے دیے ہیں میرے رزّاق نے ہر ہر دانہ کو

توکّل علی اللہ کے بارے میں حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں: ''آپ کا توکّل بھی عجیب وغریب تھا، ایک مرتبہ حج کے سفر میں ساتھ جانا ہوا، آپ کے سالے صاحب بھی ساتھ تھے، کسی جگہ وہ الگ ہوگئے، آپ کے گھر والے اور ان کی اہلیہ محترمہ بہت پریشان ہونے لگیں تو آپ ان کو تلاش کرنے چلے گئے، آپ کو بھی گئے کافی دیر ہوگئی اور اِدھر یہ دونوں خاتون مارے پریشانی وخوف کے بہت زیادہ رونے لگیں، میں نے تسلّی بھی دی کہ فکر نہ کریں، مولانا بہت تجربہ کار ہیں، جلد ہی آجائیں گے، انشاء اللہ۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا اپنے سالے کے ہمراہ آگئے، میں نے پورا واقعہ سنایا، کہنے لگے: وہ تو ہوتا رہتا ہے اللہ کے فضل سے فلاں صاحب کے ہمراہ منزل تک آگیا''۔

نیز حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب اُدگانوی مدظلّہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''حضرت الاستاذ توکّل کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، ساتھ ہی ساتھ طلبہ کی ذہن سازی بھی فرماتے تھے، چناں چہ یہ بات اکثر فرمایا کرتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ جانوروں اور پرندوں کو بھی روزی دیتے ہیں، ان کو نہیں بھولتے، تو ہم تو ان کے دین کے خادم ہیں؛ لہٰذا ہمیں رزق کی فکر کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اور اکثر یہ

شعر بھی سنایا کرتے:

اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

امانت ودیانت اور احساسِ ذمہ داری

آپ کے ذمّہ جامعہ کے بہت سارے کام تھے، آپ نے ہر کام کو امانت ودیانت سے ادا کیا، آپ کی ۵۵ / سالہ تدریسی زندگی میں جامعہ کے کسی کام میں خیانت دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی، یہاں تک کہ طلبہ کی لی ہوئی چیزیں بھی بڑی حفاظت کے ساتھ محفوظ رکھتے اور وقت پر واپس لوٹا دیتے۔ اس کا احساس اُس وقت ہوا جب آپ کی وفات کے بعد راقم نے مختلف کتابوں پر پنسل سے آپ کے نوٹس دیکھے۔ سیرتِ خاتم الانبیا پر اس طرح کی نوٹ لکھی ہوئی تھی کہ: یہ کتاب عزیزم یاسین سلّمہ کی بطور امانت میرے پاس موجود ہے، لہٰذا یہ کتاب عزیزم یاسین سلّمہ کو پہنچا دی جائے۔ نیز ایک رقعہ ہاتھ لگا جس میں لکھا ہوا تھا کہ: مدرسہ سے کسی غرض کی وجہ سے ایک روپیہ لیا تھا، اس کی ادائیگی ہوچکی جو بطورِ یادداشت موجود ہے۔ اس سلسلے میں حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ’’مولانا مرحوم بڑے منتظم تھے، آپ کے ذمہ جامعہ کے بہت سارے کام تھے، مرحوم نے ہر کام کو فکر اور امانت ودیانت کے ساتھ انجام دیا‘‘۔

تواضع وانکساری

اگر استاذِ محترم کے اخلاق کے بارے میں کوئی یوں پوچھے کہ، آپ ان کے اخلاق میں سے کوئی ایسا وصف بیان کریں جو نہایت ممتاز ہو، تو میں بلا مبالغہ کہوں گا وہ ''تواضع'' ہے، آپ کو ہر ایک نے تواضع وانکساری کا پیکر گردانا تھا، ہر چھوٹے بڑے کی ناگوار اور بارِ خاطر باتیں کمالِ احترام سے سنتے تھے، آپ نے کبھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا، عام طور پر جب انسان شہرت کی سیڑھیاں چڑھتا ہے اور مقبولیت کے زینے طے کرلیتا ہے، یا دولت وثروت کی دنیا میں پھریرے لہراتا ہے، تو جن کاندھوں پر چڑھ کر اس نے عروج وارتقا کا سفر طے کیا ہے، انہیں بھول جاتا ہے، ان کی طرف پلٹ کر بھی دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا؛ مگر استاذِ محترم کو دیکھئے نیچے سے اوپر، اوپر سے نیچے کے درجات مل رہے ہیں، اس پر نہ کوئی شکوہ وشکایت ہے اور نہ ہی کوئی فخر وتکبر۔

استاذِ محترم حضرت مفتی ابوبکر صاحب مدظلہ العالی نے بڑے عجیب انداز میں تعزیتی جلسہ میں آپ کی زندگی کا خلاصہ بیان فرمایا تھا کہ: ''اگر آپ کی زندگی کا حقیقی خلاصہ ہوسکتا ہے تو وہ تواضع ہے، ہر جگہ دیکھا جاتا ہے، لوگ اوپر بڑھنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے ہیں، بعض جگہ جھگڑے تک کی نوبت آجاتی ہے، مگر مولانا تھے کہ مدتوں اوپر سے نیچے کے درجات ذمہ آئے، اس پر کوئی تبصرہ نہیں، خوشی خوشی قبول فرمالیتے''۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ العالی فرماتے ہیں: ''مولانا مرحوم نے درجات کی ترقی اور کتابوں کی کبھی ہوس نہیں کی؛ بلکہ کبھی اس کا خیال بھی آپ کے دل میں نہیں آیا ہوگا، جو مدرسہ کی طرف سے آپ کے ذمہ دیا جاتا اس کو قبول کر لیتے''۔

مولانا عبید اللہ صاحب بارڈولی زید مجدہٗ لکھتے ہیں کہ: حضرت الاستاذ کو اکثر دیکھا گیا: کبھی بھی اپنے چھوٹوں سے کسی بات کے پوچھنے میں شرم وعار محسوس نہیں کرتے تھے، چاہے وہ علمی بات ہو یا اور کوئی بات ہو، بلا تکلف دریافت فرما لیتے تھے۔ چناں چہ اس سلسلے میں ایک واقعہ جامعہ دار الاحسان نواپور کے استاذ مولانا محسن صاحب نے سنایا کہ ایک مرتبہ مجھے ایک چھوٹا رقعہ لے کر مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم کی خدمت میں بھیجا اور استاذِ محترم کی عادت تھی کہ حاملِ رقعہ سے رقعہ پڑھوا لیتے تھے، اس میں یہ بات لکھی تھی کہ میں نے خواب دیکھا کہ لوگ چمٹ چمٹ کر رو رہے ہیں، اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟ حضرت مفتی صاحب نے فوراً تعبیر بتلا دی کہ لوگ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، حالاں کہ آپ خود بھی خواب کی تعبیر بتلایا کرتے تھے؛ لیکن اس کے باوجود اپنے شاگرد سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ تھی آپ کی تواضع''۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''مولانا کا خاص وصف تواضع تھا، بے تکلّف تھے، بندہ نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ جامعہ میں کسی جلسہ کے موقع سے اسٹیج پر بیٹھے ہو، بلکہ ہمیشہ طلبہ کے ساتھ پیچھے بیٹھ جاتے''۔

راقم نے کئی جلسوں میں بڑی گہرائی سے آپ کا مطالعہ کیا، لیکن کبھی آپ کو اسٹیج کے قریب بھی نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ جامعہ میں ''لجنۃ القراء'' کا مسابقہ چل رہا تھا، استاذِ محترم تشریف لائے اور طلبہ کے ساتھ بیٹھ گئے، اساتذہ نے اصرار کیا کہ حضرت اسٹیج پر تشریف لائیں، لیکن آپ نے منع کر دیا، آخر بہت اصرار بڑھا تو مجبوراً اسٹیج کے نیچے مہمانوں کے لیے لگے ہوئے گدوں پر جلوہ نشیں ہوئے۔ شاعر نے سچ کہا:

رہِ طلب میں جو گمنام مر گئے ناصرؔ
متاعِ وقت ان ہی شہیدوں کے نام کریں

نیز حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''جب کبھی آپ کے ساتھ امتحان وغیرہ کے لیے جانا ہوتا اور ہمارے ساتھ آپ کے شاگرد بھی ہوتے تو آپ کبھی محسوس نہ ہونے دیتے کہ میں ان کا استاذ ہوں، بلکہ اس طرح پیش آتے کہ شاگرد مارے شرم کے زمین میں گڑ جاتے، کسی سے مشورہ طلب کرتے تو کہتے: سلیم بھائی، شبیر بھائی! آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے''؟

سادگی و بے تکلفی

حدیث شریف میں ہے: ''أهل الجنة البُلهُ'' کہ سادہ لوح لوگ جنتی ہوں گے۔ آپ کے مزاج میں سادگی وانکساری اتنی غالب تھی کہ آپ اس حدیث شریف کے حقیقی مصداق محسوس ہوتے۔

آپ وضع قطع اور لباس پوشاک کے معاملہ میں مضبوطی سے سلف کے طریقے پر قائم تھے، آپ کا رہن سہن، اٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، سلوک و برتاؤ ہمیشہ سادگی کا حسن لیے رہا، سادگی مزاج میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ دوسروں کی عشرت سامانی دیکھ کر نہ اپنے اندر طمع پیدا ہونے دی، نہ شرمساری۔ ملاقات کے تعلق سے بھی اتنی سادگی تھی کہ ہر کوئی جس وقت چاہے آپ سے ملاقات کر سکتا تھا۔

اس سلسلہ میں جامعہ کے اساتذہ کے بیانات اور شہادتوں کی ایک طویل فہرست ہے، کچھ جھلکیاں یہاں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

حضرت مفتی عباس صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: ''سادگی و تواضع کا یہ عالم تھا کہ ہم دیکھ کر پانی پانی ہوجاتے، آپ ایک مدتِ دراز تک گھر سے مدرسہ سائیکل پر تشریف لاتے، میں بھی سائیکل پر آتا تھا، جب کبھی میری سائیکل پنچر ہوجاتی، استاذِ محترم کہتے: میری سائیکل پر بیٹھ جا، میں تجھ کو کھینچ لوں گا، میں کہتا: نہیں، آپ بیٹھیے، میں سائیکل چلالوں گا۔ آپ منع کرتے، میں کبھی ازراہِ ادب آپ کے ساتھ سائیکل پر سوار نہیں ہوا، آپ اصرار کرتے رہتے، لیکن چونکہ آپ میرے استاذ تھے؛ اس لیے میں کبھی نہیں بیٹھا، بہت سی مرتبہ آپ خود ہی سائیکل سے اتر جاتے اور مدرسہ سے پوسٹ آفس تک باتیں کرتے ہوئے پیدل میرے ساتھ آتے، عجب سادگی و بے تکلفی تھی''۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ کتنے پیارے انداز میں آپ کی سادگی و

تواضع کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ: ’’مولانا بڑے متواضع وسادگی پسند تھے، کبھی بھی اپنے مقام ومرتبہ کا اظہار نہیں فرمایا‘‘۔

حضرت مفتی محمود صاحب بارڈولی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ’’مولانا مرحوم کو کبھی رنگین لباس و پوشاک میں نہیں دیکھا، دولت وثروت کے مل جانے کے بعد بھی وہی سادگی نمایاں ہوتی تھی جو عسرت وتنگی کے ایام میں دیکھی گئی‘‘۔

حضرت قاری محفوظ الرحمن صاحب ڈابھیلی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ’’آپ بڑے سادہ تھے، کتنی مرتبہ آپ کو دیکھا کہ دوپہر میں کھیت کا کام پورا کرکے وقتِ مقررہ پر مدرسہ چلے آتے، اور آپ کے کپڑوں پر کھیتی کے کام کی وجہ سے دھول اور مٹی لگی ہوتی، بسا اوقات کیچڑ کے چھینٹے لگے ہوتے، لیکن آپ قطعاً شرم وعار محسوس نہ کرتے، بالکل بے تکلفی کے ساتھ درسگاہ میں حاضر ہوکر علم کے جام پلاتے چلے جاتے‘‘۔

خشیتِ الٰہی

انسانی تخلیق کا ایک بنیادی مقصد، خشیتِ الٰہی ہے، اور جس آدمی کو جس قدر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے وہ اسی قدر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، اور باری تعالیٰ کی جانب سے اس خشیت کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے، ارشادِ باری ہے: ﴿وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ﴾ مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ آپ کا دل خشیتِ الٰہی سے لبریز تھا، اس خشیت کا ظہور کبھی جلوت میں بھی ہوجاتا، عینی مشاہدات ملاحظہ فرمائیں:

ایک مرتبہ اواخرِ عمر میں سالانہ تعطیلات سے کچھ روز قبل بندہ حضرت استاذِ محترم کی زیارت وملاقات کے لیے حاضر ہوا، خیر خیریت کے بعد کچھ دیر محوِ گفتگو رہے، پھر آپ نے عجیب وغریب انداز سے موت کا تذکرہ چھیڑ دیا، اولاً اپنے سوز وگداز سے معمور لہجہ میں قرآنِ کریم کی آیتیں تلاوت فرمائیں: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ، اَيْنَمَا تَكُوْنُ يُدْرِكُّمُ الْمَوتُ﴾ پھر اس انداز میں خشیتِ الٰہی کا تذکرہ کیا کہ خود بھی نم دیدہ ہوئے اور ہمیں بھی رُلا دیا۔

بسا اوقات دورانِ سبق بھی اس کا ظہور ہوتا، خصوصاً پند نامہ کے باب ''مناجات بجناب مجیب الدعوات'' میں تو عجیب منظر ہوتا، نگاہیں قلب کی جانب ہوتیں اور قلب مالکِ حقیقی سے لَو لگائے ہوتا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے، ہر طرف خاموشی چھائی ہوتی، طلبہ استاذِ محترم کے انداز کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے، اس موقع سے ہر ایک پر عجیب کیفیت چھائی ہوئی ہوتی، مذکورہ بالا سبق میں آپ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ طلبہ اس ناگہانی اور غیر متوقع حالت کو دیکھ کر بے چین وبے قرار ہوجاتے۔ برسوں کی عبادت وریاضت کے باوجود آپ پر خشیتِ الٰہی کا وہ غلبہ تھا کہ نہ پوچھئے، مرض الوفات کے دوران ایک مرتبہ گھر جانا ہوا تو پھر اسی کیفیت کا مظاہرہ ہوا، جس کی وجہ سے استاذ کی آہ وبکا اور ہماری سسکیاں سنبھالے نہ سنبھلیں اور دیر تک خود بھی روئے اور ہمیں بھی رلایا۔

خشیتِ الٰہی کے سلسلہ میں استاذِ محترم مفتی عرفان احمد صاحب مدظلّہ رقم

طراز ہیں کہ: درجۂ فارسی دوم کی ایک اہم کتاب شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی ''بوستاں'' ہے، اس کتاب سے مولانا کو عشق تھا، تمام طلبہ کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد درسگاہ کے خوش الحان طالبِ علم سے فرمایا کہ: اب آپ صرف عبارت (اشعار کو) ترنّم سے پڑھیں، ترجمہ نہ کریں، اِدھر خوش الحان طالبِ علم نے بوستاں کو ترنم سے پڑھنا شروع کیا اور اُدھر مولانا رشید احمد صاحب وجد میں آگئے، جھوم رہے ہیں اور باقاعدہ آنکھوں سے اَشک رواں ہیں، اس وارفتگی کو دیکھ کو مجھ جیسے طالبِ علم کی آنکھ بھی نم ہوگئی''۔

فکرِ آخرت

یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے		زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

استاذِ محترم پر فکرِ آخرت کا بڑا غلبہ رہا کرتا تھا، اس لیے آپ کے ہر قول و فعل سے ہمیشہ آخرت کی فکر اور دنیا سے بے نیازی ٹپکتی تھی، اس کی کچھ جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں:

جامعہ کے درجۂ حفظ کے استاد اور آپ کے شاگردِ خاص مولانا رفیع الدین صاحب مدظلّہ فرماتے ہیں کہ: ''سادگی اتنی تھی کہ پیرانہ سالی کے باوجود ہمیشہ سائیکل پر آتے، ایک دن میں آپ کے ہمراہ آفس کے نیچے کھڑا تھا، میں نے کہا: استاذ جی! عمر بہت ہوچکی ہے، کب تک سائیکل پر آؤ گے، کوئی گاڑی لے لو۔ آپ نے بڑا فکر انگیز وعبرت خیز جواب دیا، فرمایا: مولوی صاحب! ۶۲ر سال

کی عمر ہوچکی ہے، اب کیا دنیا کی فکر کریں، آخرت کی بھی کچھ فکر کرنی ہے، جو ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔ پتہ نہیں! ۶۲ ر سے آگے پہنچوں گا بھی یا نہیں"۔ اس بات سے آپ کی فکرِ آخرت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ رقمطراز ہیں کہ: بندہ کی کم نصیبی ہے کہ مولانا مرحوم کے پاس باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ نہ کرسکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جامعہ میں درجاتِ فارسی وعربی کی متعدد درسگاہیں تھیں، میرا نام دوسری درسگاہ میں تھا، البتہ فارسی دوم میں حضرت نے پورا سال ہمارا امتحان لیا، بندہ سے بہت خوش ہوتے تھے، چونکہ اول نمبر پر بیٹھا تھا اور کامیاب بھی اول نمبر سے ہوتا اور فطرتاً اساتذہ کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک دوسری تپائی کے طالبِ علم نے میری تپائی کھینچی، جس کی وجہ سے آواز آ گئی، اس وقت حضرت نے بندہ کو بہت مارا کہ تونے اس طرح کی حرکت کیوں کی، لیکن جب پتہ چلا کہ یہ بےقصور ہے تو معافی چاہی کہ کہیں آخرت میں پکڑ نہ ہوجائے، یہ ہے مشفق ومربّی مدرس کی صفت۔

آپ کی زندگی میں فکرِ آخرت کا رنگ جھلکتا تھا، شاعر اس کی ترجمانی میں کہتا ہے:

کسی کو اگر میں نے مارا بھی ہو	بری بات کہہ کر پکارا بھی ہو
وہ آج آکے لے مجھ سے انتقام	نہ رکھے قیامت کے دن پہ یہ کام

کہ خجلت بروزِ قیامت نہ ہو		خدا کے پاس مجھ کو ندامت نہ ہو

آپ کی شخصیت اہلِ نظر کے نزدیک

اللہ والوں کا اپنا اپنا انداز اور رنگ ہوتا ہے، اللہ کے بعضے بندے انتہائی خاموشی کے ساتھ تعمیرِ ملک وملّت کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ استاذِ محترم کا شمار بھی ان ہی مقدس مخلص بندوں میں سے تھا، آپ نے پوری زندگی ہنگاموں اور شور شرابے سے یکسو ہوکر انتہائی کریمانہ اخلاق کے ساتھ وہ خدمات انجام دیں جو ہم سب کے لیے نشانِ منزل اور مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ کے اس مخلصانہ کردار اور حسنِ اخلاق کا نتیجہ تھا کہ آپ مقبول و محبوب بن کر ہزاروں لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کر گئے۔ آپ کے انتقال کے بعد بہت سارے متعلقین کے سامنے آپ کا تذکرہ ہوا، ہر ایک کی زبانی آپ کو ایک حسین اور اعلیٰ شخصیت پایا، خواص تو خواص عوام کی وارفتگی و دیوانگی کا یہ عالم سامنے آیا کہ اِدھر استاذ کا تذکرہ چھڑا اور اُدھر ان کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ آپ کی شخصیت کیا تھی اس پر آپ کے ایک شاگرد حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب مدظلّہ (صدر المدرس جامعہ خیر العلوم اُدگاؤں) اپنے ایک مضمون میں بڑے اچھوتے انداز میں رقم طراز ہیں: ’’تیرھویں صدی کے تیرہ وتار ماحول میں دیوبند اور اکابرِ دیوبند نامی وہ جزیرہ رونما ہوا جس پر اہلِ ایمان کے سفینہ نے لنگر اندازی کی اور قرونِ اولی کی ہم مثل ہستیوں کا نظارہ کیا، جنہوں نے تھکے ہارے

مسافروں کے ایمان کو محفوظ کیا، اور اسلامی حکومتوں کے سقوط وزوال کے پُرالم اور کس مپرسی کے عالمِ یاس میں ارتداد کی تیز آندھیوں کی زد میں آئے مسلمانوں کے ایمانی چراغ بجھنے سے بچا لیے۔

أولئك آبائی فجئنی بمثلهم		إذا جمعتنا يا جرير المجامع

انہیں اکابرِ دیوبند کے فیض یافتگان میں سے ایک تابندہ ستارہ مغفور و مرحوم استاذ عالی قدر حضرت مولانا رشید احمد کیاتؒ بھی تھے، موصوف اَن گنت اوصاف کے حامل تھے، حضرت اقدس ایک اعلیٰ وارفع اخلاق کی حامل شخصیت تھے، افسوس کہ موت کے گلچیں نے ایسے نرگسِ لاثانی سے گلشن کو ویران کردیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ ہم تمام کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، اور حضرت مرحوم کو اپنی مغفرت سے ڈھانپ لے، اور غریقِ رحمت فرمائے''۔ آمین

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ لکھتے ہیں کہ: ''مولانا رشید احمد کیات صاحبؒ جامعہ کے فاضل اور مخلص ومقبول مدرّس اور قوم وملّت کے خیرخواہ اور قوی ہمت عالمِ دین تھے''۔

حضرت مولانا اسماعیل صاحب پانڈورسملکی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''آپ بہت اچھے استاذ تھے، ہم جو جامعہ میں خدمت انجام دے رہے ہیں ان ہی کی دعا کا ثمرہ ہے''۔

مولوی عمار بمبوی زید فیضہ نے ایک موقع سے راقم کو بتایا: آپ کا وجود اس جامعہ میں ایک انجمن کے مانند تھا۔

استاذِ محترم مفتی عبدالقیوم صاحب کڈی مدظلہ فرماتے ہیں کہ: ''مولانا کا وجود جامعہ میں نگہبان کی حیثیت رکھتا تھا، بعض اللہ والے بڑی خاموشی کے ساتھ دینی خدمات انجام دیتے ہیں، مولانا مرحوم کا شمار بھی انہیں نیک بندوں میں تھا، آپ معاملات کے بڑے سچے پکّے تھے''۔

ڈابھیل کے باشندے محمد ایکھلوا یا صاحب کہتے ہیں کہ: ''مولانا کی شخصیت بڑی عجیب وغریب تھی، ہمارے گاؤں والے ان کا بڑا اکرام کرتے تھے، آپ ہر ایک کے لیے ایک یار و مددگار کی حیثیت رکھتے تھے، جہاں کہیں دیکھتے کہ جھگڑا فساد ہو رہا ہے، فوراً وہاں جا کر صلح کرواتے، آپ کے خلاف ڈابھیل گاؤں میں کبھی کوئی چر چا نہیں ہوتا تھا، گویا آپ کی ذاتِ گرامی متفق علیہ تھی''۔

استاذِ محترم کیا تھے؟

حق تعالیٰ نے آپؒ کی ذاتِ اقدس میں مختلف صفات ودیعت رکھی تھیں۔

حضرت قاری شبیر صاحب مدظلہ لکھتے ہیں: ''مولانا کیا تھے؟ مولانا اخلاق وعادات، معاملات ومعاشرت میں بہت عمدہ تھے، اتباعِ سنت کے پیکر تھے، بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت میں بے نظیر تھے۔ غلطی پر ٹوکنے کا اور تعلیم وتربیت کا اپنا نرالا انداز رکھتے تھے۔ وقت کی قدر شناسی، طرزِ معیشت، مخلوق کی

خدمت، بے لوث مہمان نوازی، محتاجوں کی مدد، دوسروں کے جذبات کی رعایت، تواضع وانکساری اور فنائیت واستقامت میں نمایاں تھے۔

حقیقی عالم کی چار اہم صفات ہیں: (۱) اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تقویٰ کا معاملہ کرنا۔ (۲) اپنے اور لوگوں کے درمیان تواضع وانکساری کا معاملہ کرنا۔ (۳) اپنے اور دنیا کے درمیان زہد اور بے رغبتی کا معاملہ کرنا۔ (۴) اپنے اور نفس کے درمیان مجاہدوں کا معاملہ کرنا، آرام طلبی کو چھوڑنا؛ یہ سب اوصافِ حمیدہ مولانا مرحوم کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے، بحمداللہ''۔

کلماتِ تشکّر

تمام حمد وتعریف اسی خداوندِ قدوس کے لائق ہیں جس نے اس حقیر کو اپنے محبوب بندے کی حیاتِ مبارکہ پر محض اپنے فضل سے کچھ خامہ فرسائی کی توفیق عطا فرمائی، میں اپنے پیارے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے، فضلِ خداوندی، والدین اور اساتذہ کی آہِ سحر گاہی اور دیگر معاونین ورفقا کی دعاؤں اور تعاون سے یہ کوشش بہ تاریخ جمادی الاول ۱۴۳۸ھ بہ مطابق ۲۵ / فروری ۲۰۱۷ء کو مکمل ہوئی۔

قدردان ومہربان پروردگار سے یہ التجا ہے کہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت سے نواز کر قارئین کو مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آپ کی رحلت سے پیدا ہونے والے خلا کو بہ عافیت پُر فرمائے، کروٹ کروٹ مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

اخیر میں قارئین سے امید ہے کہ اس منتشر اوراق اور شکستہ سطروں کو ایک طالبِ علمانہ کاوش سمجھ کر چشم پوشی سے کام لیں گے اور بندہ کی مناسب رہبری و رہنمائی فرمائیں گے۔وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ.

بندہ: شہزادا بن چاند اورنگ آبادی

متعلم: درجۂ عربی چہارم، جامعہ ڈابھیل